رجسٹر ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۵۳ | عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے | قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۳	بابت ماہ فروری ۱۹۶۰ء	عدد ۵

اشارات — عبدالحمید صدیقی — ۲

مقالات:

عصرِ حاضر میں دعوتِ اسلامی کی زبوں حالی — جناب عبداللہ کنون ترجمہ: خلیل حامدی صاحب — ۱۷

مولانا مودودی کا سفر بلادِ اسلامی — جناب محمد عاصم صاحب (رفیقِ سفر) — ۲۳

تخلیقِ کائنات — ایک حادثہ یا منصوبہ؟ — "فرینک ایلن" — ۵۱

مطبوعات: — عبدالحمید صدیقی — ۵۸

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

وہ لوگ جنہوں نے انسانی فطرت کا ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے پوری طرح آشنا ہیں کہ انسان جب کوئی کام کرتا ہے — خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا — اُس کے لیے وجہِ جواز ضرور ڈھونڈتا ہے۔ بلکہ جو کام جس قدر زیادہ غلط ہوتا ہے اُسی نسبت سے انسان اُسے صحیح اور برحق دکھانے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اپنے فعل کو جائز ٹھہرانے کے لیے انسان جو دلائل پیش کرے وہ دوسرں کے لیے لازمی طور پر قابلِ قبول بھی ہوں، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس معاملے میں انسان کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نئی گمراہیوں کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے نظریات اور نئے نئے نظامہائے اخلاق بھی وضع ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب انگریز نے مشرقی ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کا عزم کیا تو اُس نے اپنے اس ظالمانہ طرزِ عمل کو سفید فام کی ذمہ داری (WHITEMAN'S BURDEN) سے تعبیر کیا۔ پھر جب جرمنی کے نازیوں نے کمزور اقوام پر دستِ تظلم دراز کرنا چاہا تو فوراً ہی نسلی تفوق ایسے غیر انسانی نظریے کی تشکیل کر لی۔ اسی طرح جب اہلِ یورپ پر سے مذہب اور اخلاق کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور انہوں نے خداوند تعالیٰ کی پرستش کی بجائے حرص و آز کی غلامی اختیار کی تو اپنے اس افسوسناک انحطاط کو چھپانے کے لیے انہوں نے رجوع الی الفطرت (BACK TO NATURE) کا سہارا لیا۔ باطل نظریات کی اس لمبی فہرست میں ایک نظریہ "معاشرتی ارتقاء"[1] کا بھی ہے۔ یہ نظریہ بظاہر بڑا دلکش اور دلفریب ہے اور سطح بین آنکھوں کو یہ بہت زیادہ معقول اور صحیح بھی نظر آتا ہے مگر انسانیت کو گمراہی پر مطمئن کرنے کے معاملے میں جتنا شرمناک کھیل اس نظریہ نے کھیلا ہے کسی دوسرے نے نہیں کھیلا۔

---

[1] اس نظریہ پر تفصیلی بحث کے لیے راقم الحروف کی کتاب "انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام" ملاحظہ فرمائیں۔

فنیّ اصطلاحات اور پیچیدگیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت خود بخود تکمیل اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کا ہر قدم لازمًا آگے کی طرف ہی اٹھتا ہے آج انسانیت تہذیب و شائستگی کی جس اونچی سطح پر ہے اُس سے پیشتر یہ مقامِ بلند اُسے کبھی بھی نصیب نہیں ہوا تھا اور اس اعتبار سے ہر آنے والی حالت گزری ہوئی حالتوں کے مقابلے میں یقینی طور پر ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے۔

اس نظریہ میں جو فکری لغزشیں اور منطقی مغالطے موجود ہیں اُن پر بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آخر یہ نظریہ وضع کیوں کیا گیا؟

اہلِ یورپ نے جس وقت بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے کام لینا شروع کیا تو اس سے اُن کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی میں ایک زبردست انقلاب برپا ہوا اور بے شمار نئے مسائل اُبھر کر اُن کے سامنے آئے مگر بدقسمتی سے اہلِ یورپ اُس وقت جس مذہب سے آشنا تھے اُس کے اندر یہ قوت اور توانائی موجود نہ تھی کہ وہ ان بدلے ہوئے حالات میں ان کی راہنمائی کا فرض سرانجام دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپین قومیں ایک شدید ذہنی بحران میں مبتلا ہوئیں۔ وہ کچھ مدت تک تو اسی حالت میں پڑی رہیں۔ مگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اُن کا مذہب اُن کے اجتماعی مسائل حل کرنے سے قاصر ہے تو انہوں نے اس مذہب کو رہوار کی گرد سمجھتے ہوئے پیچھے چھوڑ دیا اور خود اپنے ناخنِ عقل سے ان الجھنوں کو سلجھانا شروع کیا۔

انسان اگر محض حیوان ہوتا تو یہ عین ممکن تھا کہ وہ ترکِ مذہب کو اپنے لیے ہر حالت میں ایک فالِ نیک ہی خیال کرتا اور مذہبی بندھن توڑ دینے کے بعد اُس کے دل میں کبھی یہ آرزو پیدا نہ ہوتی کہ وہ اُن کی طرف پلٹ کر دیکھے۔ لیکن چونکہ انسان کی زندگی میں حیوانی عنصر سے کہیں زیادہ روحانی عنصر بھی شامل ہے اس لیے وہ مادی ساز و سامان کی فراوانی کے باوجود اپنی زندگی میں ایک زبردست خلا محسوس

کرتا ہے اور اس بات کا آرزومند ہے کہ کوئی فلسفۂ حیات اُسے یہ یقین دلا دے کہ اُس کی زندگی کا رُخ تکمیل کی طرف ہے۔ چنانچہ اہلِ یورپ بھی مدتوں سے اسی خلش اور اضطراب سے دوچار تھے اور کسی ایسے فلسفے کی جستجو میں تھے جو اسے دُور کر سکتا ہو۔

اس نظریہ کی تشکیل کی دوسری وجہ خود مادیّت کی ناکامی بھی ہے۔ مادی فلسفۂ حیات نے اگرچہ یورپین قوموں کو دنیاوی مال و متاع سے مالا مال کر دیا ہے۔ ان کے اندر حرکت اور حرارت پیدا کی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ تسخیر کائنات کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئی ہیں۔ مگر ابھی تک اُن کے سامنے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کو وہ ابتدائی طور پر بھی حل نہیں کر سکیں۔ مثلاً فرد اور اجتماع کا رشتہ کیا ہونا چاہیے۔ اگر وہ فرد کو اہمیت دیتی ہیں تو سرمایہ دارانہ نظام اپنی ساری قہرمانیوں کے ساتھ اُن پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اجتماعیت پر زور دینا شروع کرتی ہیں تو پھر اُن کی انفرادی زندگی ایک ناقابلِ برداشت عذاب کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ یہ الجھن انہیں صرف زندگی کے ایک شعبے ہی میں درپیش نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں پیش آ رہی ہے۔ کارلائل نے اسی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہم آج جس نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں اُس میں ہر انسان سخت ہراساں ہے۔ کچھ لوگ اس لیے چیخ پکار کرتے ہیں کہ اُن کی بیس ہزار قمیصیں بک نہیں پاتیں اور بیس ہزار انسان اس لیے آہ و فغاں بلند کر رہے ہیں کہ انہیں تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہیں ملتا۔

ان پریشانیوں کے سامنے سرنگوں ہونے سے اگر کوئی نظریہ انسان کو بچا سکتا ہے تو صرف یہی ہے کہ اُس کے دل میں اس خیال کو راسخ کیا جائے کہ وہ بہر حال ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کا ہر قدم تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ مسائل جنہیں وہ لاینحل سمجھ کر پریشان ہو رہا ہے وہ مادی ترقی کے ساتھ خود بخود ہی حل ہو جائیں گے اور مادی ترقی کی برق رفتاری انسانیت کو ایک صحیح نصب العین سے بالآخر ہمکنار کر دے گی۔ وہ آج جس دور سے گزر رہا ہے وہ دَور اُن سارے ادوار سے ہر لحاظ سے بہتر ہے جن میں اُن کے آباؤ اجداد نے زندگیاں گزاری تھیں اور زمانہ ہر نئی کروٹ کے ساتھ انسانیت کی سطح

بلند کرتا چلا جا رہا ہے اور وہ اس طرح ہر لحظہ بالکل غیر محسوس طور پر حق اور صداقت کے قریب پہنچ رہا ہے۔

اہلِ یورپ کے اندر خود اعتمادی کی اگر کوئی رمق موجود ہے تو وہ اسی نظریہ کی رہینِ منت ہے۔ اس نظریہ کی جھلکیاں اُن کے پورے ادب اور فلسفے میں دکھائی دیتی ہیں۔ انگلستان کے مشہور شعرا ٹینی سن اور رابرٹ براؤننگ کے پورے دواوین میں یہ نظریہ بنیادی فکر کے طور پر کارفرما ہے۔ ہیگل کا سارا فلسفہ اسی کی تائید کرتا ہے۔ ہیگل انسانیت کی اس ناگزیر ترقی کو جدلی عمل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک انسانی تہذیب وتمدن کا ارتقاء دراصل اضداد کے ظہور، تصادم اور پھر امتزاج و مصالحت سے واقع ہوتا ہے۔ تاریخِ انسانی کا ہر دَور اپنی جگہ ایک وحدت، ایک کُل ہے۔ اس دور میں انسانی زندگی کے مختلف شعبے مثلاً سیاسی، معاشی اور تمدنی ایک خاص مرتبے پر ہوتے ہیں۔ ان سب کے اندر ایک گہرا ربط ہوتا ہے۔ پھر جب روحِ مطلق اپنی فطری رفتار کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے، تو خود ایک تہذیب کے مختلف شعبوں میں ایک اختلال سا پیدا ہو جاتا ہے اور وہ جلد ہی ایک دوسرے کے خلاف لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ مدت برسرِ پیکار رہنے کے بعد بالآخر تغیر کے طالبوں اور حالتِ سابقہ کے حامیوں میں صلح ہو جاتی ہے، دونوں گروہ اپنے میں سے کمزور عناصر چھانٹ کر علیحدہ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ایک نئی تہذیبی وحدت کو جنم دیتے ہیں جو دونوں گروہوں کے صالح عناصر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پہلی وحدت سے کہیں زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر آنے والا دور پہلے دَور سے لازماً افضل و اکمل ہوتا ہے۔

مارکس روحِ مطلق کی جگہ معاشی محرکات کو بنیاد بنا کر انسانیت کے تہذیبی ارتقاء کو ثابت کرتا ہے۔ ہیگل کے نزدیک اگر زمانہ روحِ مطلق کے اشارہ پر مسلسل ترقی کرتا ہے تو مارکس کے نظریہ کے مطابق معاشی محرکات انسانی ترقی کے ضامن ہیں۔ سب سے پہلے معاشی پیداوار کے طریقوں میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے، اس کا اثر براہِ راست اسبابِ زندگی کی تقسیم اور ملکیتی تعلقات پر پڑتا ہے۔ اس سے زندگی کی ساری

اقدار از خود بدل جاتی ہیں اور اس طرح ایک نیا نظام معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اب ان دونوں نظاموں میں ہیگل کے جدلی عمل کی طرح کشمکش شروع ہوتی ہے، بالآخر وہ صلح پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں مل کر ایک نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جس میں تمام صالح اجزاء شامل ہوتے ہیں ظاہر بات ہے کہ ایسا نظام پہلے نظاموں سے زیادہ صحت مند اور صالح ہوگا۔

ہم یہاں محض طوالت کے خوف سے صرف انہیں دو مفکرین کے خیالات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ اس نظریہ کو علمی اور فکری بنیادیں فراہم کرنے کے لیے تو فلاسفہ اور مفکرین کی ایک پوری فوج موجود ہے۔ میکیاویلی، ڈارون، ارنسٹ ہیکل اور کارل پیرسن کے افکار و نظریات سب اسی معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کے مؤید ہیں۔

یورپ اگر اس باطل نظریہ کو اپناتا ہے تو اس کے پاس بہر حال اس کی کچھ بنیاد اور اساس موجود ہے مگر اسے ہماری بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہماری اپنی ملت کے بعض کرم فرما اس نظریہ سے مرعوب ہو کر دانستہ یا نادانستہ اپنے تہذیبی ارتقاء کے بارے میں اسی قسم کی باتیں کہہ رہے ہیں جو معاشرتی ارتقاء کا علمبردار کرتا ہے۔ حال ہی میں ایک صاحب نے بڑے طنطنے کے ساتھ ایک مقالہ لکھا ہے جس میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مطابق حیوانات آہستہ آہستہ ترقی کر کے انسانی شکل اختیار کر لیتے ہیں یا جس طرح ایک بیج غیر محسوس طور پر برومند ہو کر ایک تناور درخت بن جاتا ہے اس طرح اسلام بھی نہایت مدھم رفتار کے ساتھ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ البتہ جب کبھی انسانوں کی کوئی جماعت اسلام کی ابدی سچائیوں کو قبول کر کے انہیں اپنے ہاں عملاً نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہے تو پھر اس کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر خارجی تحریک کمزور پڑ جائے تو پھر اسلام کی یہ جوئے رواں اپنی سابقہ رفتار اختیار کر لیتی ہے انسانی جماعت کی تائید و رفاقت سے جو تبدیلیاں انقلابی طور پر معاشرہ میں ظاہر ہوتی ہیں انہیں یہ صاحب ناگہانی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ممکن ہے اسلام کے تہذیبی ارتقاء کی اس میکانکی تعبیر کو بعض سطح بین لوگ بہت بڑی ملی خدمت خیال کریں لیکن اگر اس تعبیر کا ذرا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس تعبیر کے قبول کر لینے کے بعد اسلام کی ساری بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

جب ہم اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام ایک ازلی و ابدی دین ہے تو اس دعوے میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بنیادی حقیقت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ انسانی فطرت زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود ایک ہی رہتی ہے اور آج کے انسان اور ازمنۂ وسطیٰ کے انسان میں فطرت کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو پھر مذہب، اخلاق، تاریخ اور قانونی نظائر سب بیکار ہوتے اور ان سے نہ کوئی سبق حاصل ہو سکتا اور نہ ہی رہنمائی لی جا سکتی۔ ان سب چیزوں کا مفید اور کارآمد ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ گزشتہ زمانہ کا انسان اور زمانۂ حال کا انسان فطری لحاظ سے ایک ہی ہے لیکن اگر اس سے انکار کر دیا جائے تو پھر ان علوم کا مطالعہ بالکل فضول اور وقت کے سیاسی یا تمدنی مسائل میں ان کی عدالت سے فیصلہ طلب کرنا بیکاری کا مشغلہ بن کر رہ جاتا ہے بلکہ ایسی حالت میں تو یہ بھی ناممکن ہے کہ تاریخی ارتقاء کی اس منزل پر ہم ان انسانوں کے اجتماعی اعمال و محرکات اور طرزِ عمل کو سمجھ سکیں یا ان کی توجیہ کر سکیں جو ہم سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کی ذہنی سطح ہم سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔ کیونکہ جب ہم اپنے ذہن اور اپنی زندگی پر وہ تمام حالتیں طاری نہ کر لیں جن کے اندر سے زمانہ گزشتہ کا انسان گزرا تھا۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم اُس کے تمدن یا معاشرت سے کوئی مفید سبق حاصل کر سکیں۔ ہم جو ماضی کے واقعات اور تجربات سے ہر آن فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں تو وہ صرف اسی بنیاد پر ہے کہ ہمارے موجودہ ذہن اور ہمارے محرکات اور نفسی اعمال اُن انسانوں کی ذہنی کیفیات کے ساتھ گوناگوں یگانگت اور مماثلت رکھتے ہیں جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ہم بڑی کامیابی کے ساتھ اُن حالتوں کو اپنے اوپر طاری کر سکتے ہیں جو اُن پر ماضی میں طاری ہوتی تھیں۔ غور کیجیے کہ جو محرکات آج انسان کو جنگ و صلح، دوستی و دشمنی تعمیر و تخریب پر ابھارتے ہیں وہ اُن محرکات سے کس طرح مختلف تھے جنہوں نے عہدِ عتیق میں انسانوں کو

سرگرم عمل کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی بنیادی فطرت آج بھی وہی ہے جو سینکڑوں ہزاروں سال پہلے تھی اور اسی وجہ سے اسلام کو اس بات کا استحقاق ہے کہ وہ نوعِ بشری کے ہر فرد سے ۔۔۔ خواہ اُس کا تعلق ساتویں صدی سے تھا یا وہ آج سے چار صدیاں بعد دنیا میں جنم لینے والا ہے ۔۔۔ غیر مشروط پیروی کا مطالبہ کرے۔ اگر اسلامی تعلیمات ایک خاص دَور کی ذہنی فضا میں ہی صحیح طور پر سمجھ میں آسکتی ہیں تو پھر معاذ اللہ خالقِ کائنات کا یہ دعویٰ صرف ایک بڑا ابول بن کر رہ جاتا ہے کہ اسلام ہی ایک ابدی نظامِ حیات ہے۔

معاملہ پھر یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ خداوند تعالیٰ نے جزا اور سزا کے جو تصوّرات ہمیں دیئے ہیں وہ بھی بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک انسان پھر بڑی آسانی کے ساتھ خداوند تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہے کہ حضور، مجھے جس دَور میں پیدا کیا گیا تھا اُس میں میری ذہنی سطح اتنی بلند نہ تھی کہ وہ آپ کے احکام اور فرامین تک رسائی حاصل کر سکتی۔ لہٰذا آپ مجھے سزا دینے میں قطعاً حق بجانب نہ ہوں گے۔ آپ نے خود ہی میرے لیے ایک ایسا دَور منتخب فرمایا جس میں رہتے ہوئے میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں آپ کے اس دین کو پورے شرحِ صدر کے ساتھ سمجھ سکتا جو ابھی خود ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اب اگر آپ اس بات کے خواہش مند ہیں کہ ہم پورے دین کو اپنائیں تو براہِ کرم ہمیں ازلی زندگی عطا کیجیے تاکہ تکمیلِ دین کے ساتھ ساتھ ہمارا ذہنی ارتقا بھی مسلسل جاری ہے اور اسے سمجھنے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اس قسم کا موقع ہم پہنچائے بغیر اگر آپ ہماری کوتاہیوں پر گرفت کرتے ہیں تو یہ آپ کی زیادتی ہے جو آپ جیسی عادل ذات کو زیب نہیں دیتی۔

ہمارے نزدیک اس فلسفہ کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اسے قبول کر لینے کے بعد ہمارے دلوں میں اس دَور کی وقعت کم ہو جاتی ہے جسے ہم نوعِ بشری کا ایک روشن ترین دَور کہتے ہیں۔ اور جو نہ صرف ہمارے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے جس کے متعلق ہم یہ ایمان رکھتے

ہیں کہ اسلامی تعلیمات اسی بابرکت عہد میں احسن اور اکمل طریق سے عمل کے سانچے میں ڈھلی ہیں۔ قافلہ انسانیت ہدایت اور رہنمائی کے لیے ابدالآباد تک اسی دَور کی روشنی کا محتاج ہے۔ اس دور سے صرفِ نظر کر کے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی جادۂ مستقیم پر قائم نہیں رہ سکتا۔ قرآن پاک کا یہ مژدہ جانفزا کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ معاذاللہ کوئی شاعرانہ ترنگ نہیں بلکہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ وہ خدا، جس نے قرآن مجید نازل فرماکر تکمیلِ دین کی بشارت دی ہے، اُسی نے حضورؐ سرورِ دوعالم خاتم الانبیاء کے ذریعہ اس بات کا بھی التزام فرمایا کہ دین اپنی مکمل ترین شکل میں اس دنیا میں بالفعل نافذ کر کے بھی دکھا دیا جائے تاکہ آنے والی نسلوں کو اس کی عملی تعبیر میں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہ آئے۔

غور کیجیے اگر یہ دین اُس دَور کی انسانی فطرت سے نامانوس ہوتا تو حضورؐ کے جان نثار فدائی اسے کس طرح اپنا سکتے تھے۔ یہ دین اُن کے دلوں میں اترنے کی بجائے اُس وقت کا انتظار کرتا جب انسانیت ترقی کے سارے مراحل طے کر کے آخری منزل پر پہنچ جاتی۔ اگر معاشرتی ارتقاء کے اس احمقانہ نظریہ کو صحیح مان لیا جائے تو پھر تاریخ انسانی کا سب سے درخشندہ دَور وہ نہیں قرار پاتا جس میں حضورؐ اور اُن کے جلیل القدر اصحاب نے اپنی پاکیزہ اور مقدس زندگیاں بسر کی ہیں بلکہ وہ دور ٹھہرتا ہے جب انسانیت ارتقاء کی ساری منزلیں نہایت کامیابی کے ساتھ طے کر لے۔

پھر اس نظریہ کو اپنانے کے بعد اُس دَورِ سعید کے بارے میں انسانی ذہن پر بالکل فطری طور پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقائے کار کی خدمات خواہ نوعیت کے اعتبار سے کتنی ہی اہم ہوں، مگر ان کی مخلصانہ جدوجہد سے دنیا میں جو انقلاب برپا ہوا وہ سراسر مصنوعی تھا۔ اُس دَور کی ذہنی سطح چونکہ آج کے مقابلے میں پست تھی اس لیے وہ اسلام کے انقلابی پیغام کو کماحقہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ لہٰذا حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اور کیا وہ اگرچہ بالکل صحیح اور درست تھا مگر وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ تھا بلکہ انہوں نے اُس انسانیت کو جو پرائمری کی تعلیم کے قابل تھی ایم۔ اے کے درس دینے شروع کر دیئے اور اسی وجہ سے عوام الناس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشاداتِ عالیہ کو پوری طرح سمجھ نہ سکے اور اُن کی مخالفت شروع کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور سرورِ کائنات نے حسنِ تلقین، جوشِ عمل اور بہتر نظامِ تعلیم و تربیت کے ذریعے کچھ لوگوں کو تعلیماتِ الٰہی کے قبول کرنے پر فکری طور پر آمادہ کر لیا تھا مگر عام انسانیت ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہ تھی۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں حضورؐ اور آپ کے جلیل القدر اصحاب کی کارگزاریوں کی اس نظریہ کی رُو سے اصل حقیقت، جو ہمارے اپنے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ معاشرتی ارتقاد کے اس باطل نظریہ کا بالکل منطقی نتیجہ ہے۔

آئیے اب اس نظریہ کے مضمرات کا دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی جائزہ لیں۔

اس نظریہ کو جب کوئی فرد قبول کر لیتا ہے تو قدرتی طور پر اُس کے ذہن میں یہ احساس پرورش پاتا ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی پوری سعی کی مگر وہ معاذ اللہ اتمامِ حجت نہ کر سکے۔ جب ایک دَور کے لوگوں میں یہ ذہنی صلاحیت ہی مفقود ہو کہ وہ ایک اعلیٰ اور ارفع نظامِ حیات کو سمجھ سکیں تو پھر اُن پر اتمامِ حجت کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ بیچارے اگر انکار کر دیتے ہیں تو ایسا کرنے پر وہ فطری طور پر مجبور ہیں لہٰذا وہ خدا اور خلق کی نگاہ میں قطعاً مجرم نہیں۔ قدرت نے خود ہی ان کی راہ میں بہت سے موانع پیدا کر دیئے ہیں۔ اس لیے کفر و عصیان کی ذمّہ داری کسی صورت میں بھی اُن پر عائد نہیں ہوتی بلکہ خود فطرت پر عائد ہوتی ہے جس نے اُن کے اندر یہ ذہنی صلاحیت ہی پیدا نہ کی کہ وہ حق کو شرحِ صدر کے ساتھ قبول کر سکیں۔

استدلال کے اسی طریق کو اگر آگے بڑھایا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہم جو مختلف افکار و اقدار پر نیک و بد، محمود و مذموم یا حق و باطل کا اطلاق کرتے ہیں یہ بھی ہماری صریح زیادتی ہے۔ جب ایک شخص ایک مخصوص دَور کے ذہنی افلاس کی وجہ سے حق کو پہچان نہیں پاتا تو اس میں اُس کا کیا قصور ہے۔ وہ بیچارا تو اس معاملے میں مجبورِ محض ہے لہٰذا اُس کے کسی قول یا فعل کو صحیح یا غلط کس طرح ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ وہ شخص اپنے دَور کی جتنی جزوی صداقتیں سمجھ سکتا ہے وہ صرف انہیں قبول

کرنے کا ہی مکلف ہے۔ ان سے بڑھ کر اُس شخص سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ پورے کے پورے دین کو اپنالے اس نقطۂ نظر کے مطابق صریح ظلم ہے۔ جب انسان کی ذہنیت اور سیرت کی تشکیل میں عصری سطح ہی کو اصل اہمیت حاصل ہے جس کے تعین کرنے میں اسے کسی طرح کا اختیار یا قدرت حاصل نہیں تو پھر اُس کے افکار و اعمال کی ذمہ داری اس پر کیونکر ڈالی جاسکتی ہے۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے، یا جو کچھ کرتا ہے وہ سب کچھ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کے تحت کر رہا ہے۔ ہم ایک شخص کو گمراہ صرف اسی صورت میں کہہ سکتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ اُس کے اندر حق کو قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود تھی مگر اُس نے محض تعصب، ہٹ دھرمی اور ضد کی بنا پر صحیح روش کو اختیار کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ عصری تقاضوں کے دباؤ سے سرزد ہو رہا ہے تو پھر وہ شخص تو بہر حال بے قصور رہے۔

اس کے علاوہ اگر کوئی شخص معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کو صحیح اور درست مانتا ہے تو پھر وہ حضورؐ کے افکار و اعمال کو کبھی بھی دین کے اندر حجت تسلیم نہیں کر سکتا۔ حضورؐ کا جسمانی تعلق تاریخِ انسانی کے ایک ایسے دَور سے تھا جس میں انسانیت کی ذہنی سطح آج کے مقابلے میں کچھ زیادہ بلند نہ تھی اس لیے انہوں نے جو کچھ کیا وہ اپنے عہد کے مخصوص حالات میں تو بالکل صحیح اور درست ہے مگر آج جبکہ انسان فکری اعتبار سے ماضی کی بہ نسبت بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے اسے کیونکر دین کے اندر آخری سند کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے سنتِ رسولؐ محض ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتی ہے جس سے کتابوں کے صفحات کو تو مزین کیا جاسکتا ہے مگر زندگی کے اہم معاملات میں اُس سے کوئی رہنمائی نہیں لی جاسکتی۔ جب یہ فرض کر لیا جائے کہ جس دَور میں حضورؐ پیدا ہوئے اُس وقت کی ذہنی سطح آج کے مقابلے میں پست تھی تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے جس طریق سے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی وہ طریقہ آج کے روشن دَور میں کچھ مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا۔ وہ تعلیم جو ایک

دور کے فکری تقاضوں کو پورا کرتی ہو اُس دور کے خاتمہ کے بعد خود بخود ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ چونکہ انسان کی ذہنی سطح مسلسل بلند ہو رہی ہے اس لیے ہر دور کے لیے اسوۂ حسنہ بھی الگ ہی ہونا چاہیے۔ حضورؐ کا اسوہ درخشندہ و تابندہ ہی سہی مگر وہ عہدِ حاضر کے عصری تقاضوں میں کچھ رہنمائی نہیں دے سکتا۔ چنانچہ دیکھیے کہ جو لوگ معاشرتی ارتقاء کے اس فلسفہ پر ایمان رکھتے ہیں ان میں سنت رسولؐ اور آثار صحابہ سے بیزاری کا ایک عام رجحان پایا جاتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک دنیا کا ہر اصول اضافی ہے۔

یہ ارباب علم و فکر اپنی ساری فہم و فراست کے باوجود اس سادہ سی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان ذہنی لحاظ سے مسلسل بلندی کی طرف جا رہا ہے اور ہر آنے والے دور کی ذہنی سطح پہلے ادوار کے مقابلے میں لازمی طور پر بلند ہوتی ہے، تو پھر ماضی کے سارے تجربات ہمارے لیے بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ تجربہ کا سارا مواد گزشتہ واقعات ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر انسانیت کے وہ تجربات اور اُن سے اخذ کردہ نتائج جو اُس نے ناقص ذہن کے ساتھ حاصل کیے ہیں وہ ارفع و اعلیٰ ذہن کے لیے کسی طرح بھی مفید اور کار آمد ثابت نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس پر بالعموم دو قسم کے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ جو لوگ دین کو نہیں مانتے وہ یہ کہتے ہیں کہ نئے حالات میں عقل ہماری مدد پر آتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عقل خود کیا چیز ہے۔ وہ بھی آخر تجربہ کا ایک وظیفہ ہے کیونکہ اسے جو کچھ ملتا ہے وہ تجربہ ہی سے ملتا ہے۔

دوسرا گروہ، جو دین کو کسی حد تک مانتا ہے، یہ کہتا ہے کہ انسانی رہنمائی کے لیے تنہا عقل کافی نہیں بلکہ انسان اس زندگی کو ٹھیک طور پر گزارنے کے لیے وحی الٰہی کا محتاج ہے۔ مگر یہاں ایک دوسری نوعیت کی الجھن پیش آتی ہے۔ وحی الٰہی اگر محض افکار و تصورات کا مجموعہ ہوتی تو اس جواب کو تسلیم کرنے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہ آتی۔ مگر یہاں معاملہ یہ ہے کہ یہ وحیٔ الٰہی جو قرآن مجید میں محفوظ ہے، ایک دین، ایک ضابطۂ حیات ہے جو اپنے ماننے والوں سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اُسے عملی زندگی میں نافذ بھی کیا جائے اور یہ طریقِ نفاذ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ خود وحی۔ وحی کو اگر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید

میں محفوظ فرمایا ہے تو اس کے نفاذ کے طریقوں کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ توضیح فرمائی ہے۔ ہمارے لیے یہ وحی جس قدر ضروری ہے اتنا ہی ضروری وہ طریقہ بھی ہے جس کے مطابق یہ وحی زمان و مکان کی لوح پر ثبت کی جانی چاہیے۔

آپ ذرا غور کریں کہ اس معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کو مان کر ہمیں کس قسم کے منطقی مغالطوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنت کو پسِ پُشت ڈال کر ہماری عقل صرف قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے تو یہ بہت بڑی خود فریبی ہے۔ عقل نے تو سارا مواد ماضی کے تجربات سے حاصل کیا ہے اور ماضی کے تجربات اس نظریہ کی رُو سے بالکل بیکار ہیں کیونکہ جس وقت یہ تجربات کیے گئے تھے اُس وقت انسان کی ذہنی حالت اور تھی اور آج اُس سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے ماضی کے تجربات زمانۂ حال کے لیے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

لیکن اگر اس کے برعکس یہ کہا جائے کہ قرآن مجید سے صحیح رہنمائی سنت کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے تو پھر معاشرتی ارتقاء کا نظریہ کا خود بخود ابطال ہو جاتا ہے۔ سنّت کو حجّت ماننے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس حقیقت کو بھی تسلیم کریں کہ اُس دور کی ذہنی سطح جس میں حضورؐ تشریف لائے اور آج کل کی ذہنی سطح میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ انسان کی بحیثیت انسان کے بہترین اندازے کے مطابق تخلیق کی گئی ہے۔ اس کی عقل کا دائرۂ کار بلاشبہ بدلتا رہتا ہے مگر خود اس میں قطعاً کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ انسان کا تعلق خواہ چھٹی صدی سے ہو یا بیسویں صدی سے، خدا کا دین ہر دور میں اُس سے غیر مشروط وفاداری اور اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے مگر انسان کو اس امر کا بھی اختیار دے دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اسے قبول کرے اور اگر چاہے تو اس سے انکار کر دے۔ تاریخ کی مختلف کروٹیں اُسے حق و صداقت کے قریب تو لا سکتی ہیں مگر جبر کے ساتھ اس بات کے لیے آمادہ نہیں کر سکتیں کہ وہ اسے لازمی طور پر اپنا بھی لے۔ اس کا انحصار خارجی حالات پر نہیں بلکہ اس کے داخلی احساسات پر ہے۔

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ   ہم نے اسے راستہ دکھلا دیا ہے۔ چاہے تو وہ

اِمَّا کَفُوْرًا | شکر گزار رہو اور چاہے تو انکار کر دے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۔ | جو کوئی چاہے ایمان لے آئے اور جو کوئی چاہے انکار کر دے۔

بیجا نہ ہو گا اگر ہم بات ختم کرنے سے پیشتر اس امر کی بھی صراحت کر دیں کہ دوسرے نظامہائے حیات میں اسلامی تعلیمات کی کچھ جھلکیاں دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ دنیا اضطراری طور پر اسلام کی طرف بڑھ رہی ہے محض فریب خیال ہے۔ آج کی غیر مسلم قومیں اسلام سے اتنی ہی دور ہیں جتنی کہ دس صدیاں پیشتر کی کافر قومیں تھیں۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ دورِ جدید نے اسلام کے بعض اصولوں کو اپنا لیا ہے مثلاً انسانیت نے اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے کا ڈھنگ سیکھا ہے، غلامی کا خاتمہ ہوا ہے، نسلی تفوق کی جڑ کٹ گئی ہے، جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی سے انسانیت کو نجات حاصل ہوئی ہے اور اب دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں نے قومی اور نسلی تعصبات کو پس پشت ڈال کر انسانیت کی وسیع تر بنیادوں پر نظامِ حیات کی تشکیل کرنا شروع کی ہے، تو ان تبدیلیوں کے بارے میں بھی صرف یہی کہا جا سکتا ہے:

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیا روس میں جو اس وقت دنیا کی ایک زبردست سیاسی اور معاشی قوت ہے، سارے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں، الجیریا میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، اور کوریا اور جاپان میں ابھی چند ہی دن پہلے جو کچھ ہوا تھا، انہیں دیکھ کر کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اب انسان نے غلامی کو ایک لعنت سمجھ کر اُسے ترک کر دیا ہے۔ امریکہ میں جو انسانیت سوز سلوک سیاہ فام لوگوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے کیا اُسے نسلی تفوق کے خاتمہ کی دلیل بنایا جا سکتا ہے۔ مغرب کی استعمار پسند قوموں نے مشرق کی بے سرو سامان اقوام کے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے اور جو اب بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے، کیا اس کو جانتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب انسانیت نے جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی کا گلا گھونٹ

دیا ہے ۔ دنیا کی بڑی بڑی قومیں ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کے لیے جس قسم کی ہولناک تیاریاں کر رہی ہیں کیا وہ سب کچھ انسانیت کی خیر خواہی کے جذبہ سے کیا جا رہا ہے ۔ یہ سب فتنہ سامانیاں اور ہلاکت خیزیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ اسلام کے باغی آج بھی فطرت کے اعتبار سے اُسی مقام پر ہیں جس پر کہ چودہ سو سال پیشتر تھے ظلم و استبداد کے محض چولے بدلنے سے ظلم و استبداد ختم نہیں ہوتا ۔ دیدۂ بینا ہو تو اُسے فوراً پہچانا جا سکتا ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من اندازِ قدت را می شناسم

پھر اس ضمن میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ غیر اسلامی نظامہائے حیات میں اسلام کے چند اجزا کا موجود ہونا صرف ہمارے اس دَور کی خصوصیت نہیں ۔ دنیا نے آج تک کوئی ایسا نظام حیات مرتب نہیں کیا جو اسلامی تعلیمات سے یکسر خالی ہو ۔ اسلام ایک ازلی و ابدی صداقت ہے اس لیے کسی بھی نظام کے قیام کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ اُس میں کچھ اجزا حق و صداقت کے بھی شامل کر لیے جائیں خالص باطل تو ایک لمحہ کے لیے بھی دنیا میں چل نہیں سکتا جس طرح اسلامی تعلیمات کے کچھ اجزا آج ہمیں غیر اسلامی نظاموں میں نظر آتے ہیں ۔ اسی طرح ازمنۂ وسطیٰ کے قبائلی نظام میں بھی انہیں کامیابی کے ساتھ تلاش کیا جا سکتا ہے ۔

کسی نظام حیات کا اصل جوہر اُس کے اجزا نہیں ہوتے بلکہ وہ رشتۂ تناسب ہے جس کے تحت ان اجزاء کو جوڑ کر ایک نظام کی تشکیل کی جاتی ہے ۔ کافرانہ نظام کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ وہ حق و صداقت سے بالکل تہی دامن ہے ۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اُس نظام حیات میں مختلف شعبوں کو جس طرح مرتب کیا گیا ہے اُن میں الحاد ایک بنیادی تصوّر کے طور پر شامل ہے ۔ دنیا کا ہر نظام چونکہ انسان سے بحث کرتا ہے اس لیے مختلف نظامہائے حیات میں بعض چیزوں کا اشتراک ایک فطری سی چیز ہے لیکن اس اشتراک سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ وہ روح کے اعتبار سے ایک ہی ہیں بہت بڑی غلط فہمی ہے

اسلام کو کفر سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ صرف یہی ہے کہ اُس نے زندگی کے سارے شعبوں کو ایمان باللہ کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔ اور یہ بنیادی تصور ہی اس نظام کی جان ہے۔ آپ انسانی چہروں پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو ہر چہرہ دوسرے سے مختلف نظر آتا ہے۔ حالانکہ اعضاء کے اعتبار سے اُن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان اعضاء کو ہر چہرے پر جس تناسب کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے وہ ہر ایک میں الگ الگ ہے۔ اور یہی تناسب ایک چہرے کو دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ لہٰذا اس فیصلے کا دار و مدار کہ کیا انسانیت اسلام کی طرف بڑھ رہی ہے اس بات پر موقوف نہیں کہ اُس نے اسلام کے چند اصولوں کو اپنا لیا ہے، بلکہ اس معاملے میں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا انسانیت نے پورے شعور اور رضا و رغبت کے ساتھ اسلام کے اُس بنیادی تصورِ حیات کو اپنانے پر آمادگی ظاہر کی ہے جس کے مطابق اسلامی نظامِ حیات کے مختلف شعبوں کو مرتب کیا گیا ہے۔ یہی چیز انسانیت کی ترقی اور تکمیل میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسی سے اس بات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسانیت فی الواقع اسلام کے کس قدر قریب پہنچی ہے۔

عہدِ حاضر میں دعوتِ اسلامی کی زبوں حالی

از عبداللہ کنون ۔ گورنر طنجہ (مراکش)

[فاضل مقالہ نگار جناب عبداللہ کنون دنیائے اسلام کی معروف علمی اور ادبی شخصیت ہیں۔ مراکش کی جنگِ آزادی میں ان کا کافی حصہ ہے۔ استقلالِ مراکش سے پہلے طنجہ میں ایک اسلامی درسگاہ کے مدیر تھے، جس کے بانی بھی یہ خود ہی تھے۔ طنجہ کی مجلسِ علمی کے صدر بھی تھے۔ جہادِ آزادی کے دوران جب طنجہ سے تطوان (مراکش کا اسپینی خطہ) ہجرت کر گئے تو وہاں وزیرِ عدل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ موصوف طویل عرصہ تک تطوان کے علمی ریسرچ انسٹی ٹیوشن (معہد مولائے حسن) کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ ان تمام مشاغل کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے جاری کردہ ماہنامہ ’لسان الدین‘ کو بھی چلاتے رہے ہیں۔ آج کل طنجہ کے گورنر ہیں۔ آزادی کے بعد مراکش جس قسم کے سیاسی و اجتماعی حالات سے دوچار ہے ان میں اور پاکستان کے حالات میں بہت کم تفاوت نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس مقالے کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں   گفتہ آید در حدیثِ دیگراں   (خ-ح)

عصرِ حاضر میں دعوتِ اسلامی پر جو زبوں حالی و بے کسی طاری ہے۔ تاریخ کے کسی دَور میں وہ ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوئی اور عصرِ حاضر کے مدعیانِ اصلاح کے ہاتھوں اس کی اقدار و خصائص کو جس طرح مسخ کیا گیا ہے۔ عہدِ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ امام بوصیری رحمہ اللہ کا قول ہے: ”ومن شدۃ الظھور الخفاء“ (کسی چیز کا زیادہ نمایاں ہونا بھی اس کی پوشیدگی کا سبب بن جاتا ہے، موجودہ بدتر حالات پر ــــ جن میں اسلام سراسیمہ ہو کر ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے مگر اس کے ماننے والے اُسے نشاۃِ ثانیہ اور ترقی کی جانب گامزن سمجھ رہے ہیں ــــ جس صحت کے ساتھ صادق

آ رہا ہے پہلے کبھی نہ آیا ہو گا۔

دعوتِ اسلامی کے روشن ایام اس میں کوئی شک نہیں کہ دعوتِ اسلامی کا کاروان آغازِ سفر ہی میں سنگین مزاحمتوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ اور روزِ اول ہی سے چند در چند مخالفتوں کے طوفان اس کی اقدار و ممیزات سے متصادم ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ ہجرتِ نبوی کا دور، بعد ہجرت کا مرحلہ کا دور، خلفائے راشدین کا زمانہ، اموی عہد اور پھر عصرِ عباسی جب کہ اسلامی تہذیب و تمدن پوری طرح اپنی جڑیں جما چکا تھا اور مسلمانوں کو علوم و فنون میں ید طولیٰ حاصل ہو چکا تھا، ان تمام ادوار میں دعوتِ اسلامی پر کبھی یہود کی چیرہ دستیاں، کبھی منافقین کی ریشہ دوانیاں، کبھی خوارج و معتزلہ کی طوفان خیزیاں اور کبھی باطنیہ، زنادقہ اور ملاحدہ کی کینہ توزیاں حملہ آور ہوتی رہی ہیں مگر ان سب کے علی الرغم دعوتِ اسلامی نے کبھی اپنی ڈگیں نہیں ڈالیں اور کسی موقع پر سرنگوں نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر محاذ پر اس نے پہاڑ کی سی ثابت قدمی کے ساتھ ہر مزاحم قوت کو پسپا کیا، ہر مخاصمت کو حرفِ غلط کی طرح مٹایا اسے ہمیشہ غلبہ حاصل رہا اور اس کی صفوں کو ہدفِ انتشار بنانے کی ہر کوشش اس کی شیرازہ بندی کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کا موجب ہوئی۔ اس میں تغیر و تبدل کو کبھی راہ نہ مل سکی۔ جو کچھ تغیر ہوا وہ صرف اس کے ذرائع و وسائل میں ہوا۔ حالات کے تقاضوں اور ارتقا کے عوامل کے تحت ہوا۔ رہا اصولوں کا تعلق تو ان میں کسی تبدیلی یا تحلل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ حالات و حوادث کے سخت حملوں کے باوجود اس کی اساسات قائم و دائم رہیں۔ جس نے بھی انہیں منہدم کرنے یا متزلزل کرنے کی جسارت کی اُسے دعوتِ اسلامی، کی طرف سے سخت چیلنج دیا گیا — اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پوری شان کے ساتھ حالات پر چسپاں ہوتا رہا کہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔

جہاں تک عہدِ نبوت کا تعلق ہے، اس مبارک عہد میں دعوتِ اسلامی پر جو بحرانی کیفیات طاری ہوئیں اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے توفیقِ وحیِ الٰہی، کلمۃ اللہ کو بالاتر کرنے اور دوسرے تمام کلموں کو نگونسار کرنے کے لیے جو مثالی جہاد کیا — حتیٰ کہ حق کامیاب ہو گیا اور باطل نامراد

ہوگیا اور جزیرۂ عرب میں کوئی ایسا متنفس باقی نہ رہا جو کفر و نفاق کے ساتھ بالا سر کو چل سکتا ہو۔ اس کی مثالیں پیش کرنے کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ صاحبِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جو کچھ کیا وہ آپ کے فرائض میں داخل تھا اور آپ کی مہم عظیم کا تقاضا تھا۔ قرآنِ کریم میں دعوتِ اسلامی کے ان مراحل و ایام کی اور دینِ حق کے غلبہ و تفوق اور ہر گوشۂ ملک تک اُسے پہنچانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کارناموں اور قربانیوں کی طویل روداد موجود ہے۔ جو شخص اس معجز طراز اور حیرت افزا روداد کو معلوم کرنا چاہے وہ قرآن کے متعلقہ حصوں کی طرف رجوع کر کے معلوم کر سکتا ہے۔

فتنۂ ارتداد یا دعوتِ اسلامی کی پہلی آزمائش دورِ خلافتِ راشدہ کی سب سے پہلی آزمائش جس کی بھٹی سے دعوتِ اسلامی کو گزرنا پڑا، فتنۂ ارتداد کا ظہور ہے جس میں بعض عرب قبیلوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور زکوٰۃ کو ایک ایسا ٹیکس سمجھ بیٹھے تھے جو ان کی قید و بندش سے آزاد اور بے لگام بسر ہونے والی زندگی کے منافی تھا۔ لیکن خلیفۂ اوّل کے مدبّرانہ موقف کے طفیل یہ دعوت اس امتحان سے انتہائی استقامت کے ساتھ اور عظیم کامرانی اور سرخروئی کے ساتھ نکلی۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو صحابہ کی تمام جماعت نے مخالفت کی۔ یعنی کہ حضرت عمرؓ جیسے شخص نے بھی، جو سخت گیری اور غیرت مندی میں مشہور تھے، اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا: انقاتلھم علی الشاۃ والبعیر؟ (کیا آپ بھیڑ بکریوں کی خاطر اُن کے خلاف تلوار اٹھانے لگے ہیں)، مگر ابوبکر صدیقؓ نے جواب دیا: "خدا کی قسم اگر یہ لوگ زکوٰۃ کی اس رسّی کو بھی دینے سے انکار کریں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس کی خاطر بھی ان سے لڑوں گا"۔ فی الواقع اگر حضرت ابوبکرؓ یہ مضبوط موقف اختیار نہ فرماتے تو زکوٰۃ کا حکم نسیاً منسیاً ہو جاتا اور اس کے بعد اسلام کے دوسرے اصول و ارکان بھی ایک ایک کر کے منہدم ہو جاتے اور آج ہمیں اسلام کا نام و نشان تک بھی نظر نہ آتا۔

انکارِ زکوٰۃ کا اجتماعی نقصان کیا تھا؟ انکارِ زکوٰۃ کا معاملہ صرف اتنا ہی نہ تھا کہ دین کا ایک

شعار معطل کیا جارہا تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مالداروں پر جو زکوٰۃ فرض کی ہے اُس سے غریبوں اور حاجتمندوں کو محروم کیا جارہا ہے۔ اس لحاظ سے صدیقِ اکبر کی جنگ ہٹ دھرم سرمایہ داری کے خلاف تھی جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ دنیا کے اندر جینے اور لذائذ دنیا سے لطف اندوز ہونے کا حق تنہا اُسی کو حاصل ہے۔ اور یہ فراموش ہو گیا کہ یہاں انسانوں کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی تہی دست ہے اور لازم ہے کہ اس کی خبر گیری اور مواسات کی جائے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

حضرت ابوذرؓ کی دعوتِ اشتراکیت عجیب اتفاق ہے کہ عہدِ خلافتِ راشدہ کا دوسرا حادثہ جو دعوتِ اسلامی کے لیے نئی آزمائش کا پیغام لے کر آیا، طبقۂ غربار کے اندر برپا ہُوا اور قریب تھا کہ ملّت کے اجتماعی و اقتصادی نظام میں اسلامی اصولوں کے خلاف بغاوت بھڑکا دیتا۔ اس فتنہ نے طبقۂ غربار کے اندر اشتراکیت (سوشلزم) کے انتہا پسندانہ نظریہ — جو متمول انسانوں سے ان کی دولت اور مالکانِ اراضی سے ان کی زمین سلب کرنے کی کشمکش برپا کر دیتا ہے اور ان تمام امتیازی حدود کو پامال کر جاتا ہے جو انسانی سوسائٹی کے مختلف طبقات کے اندر عرفِ انسانی میں پشت ہا پشت سے مسلّم چلے آرہے ہوتے ہیں — کی تخم ریزی شروع کر دی۔ اور اسے بار آور ہونے کے لیے خاصا زرخیز میدان ہاتھ آگیا۔ اس نظریہ کے علمبردار جلیل القدر صحابی حضرت ابوذرؓ غفاری تھے۔ حضرت ابوذرؓ دمشق کی شاہراہوں اور چوکوں میں کھڑے ہو جاتے اور راہ گیروں سے پکار پکار کر کہتے: "بشّر الکافرین بنار یحمیٰ علیھا ما کنزوا فتکویٰ جباھھم وجنوبھم وظھورھم" (کافروں کو اس آگ کی خوشخبری سنا دو جس سے ان کے خزانے تپائے جائیں گے اور انہی کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا)۔ اس مہم میں حضرت ابوذرؓ کے ساتھ ان کا ایک غلام بھی تھا۔ دونوں کے بدن پر یکساں لباس ہوتا تھا اور دونوں ایک ہی قسم کا کھانا ایک ہی جگہ مل کر کھاتے تھے۔ ان کی باتوں کو سننے کے لیے غریبوں اور فقیروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو جاتے۔ ان کے افکار و خیالات سے ان شہروں کے مسلمان خاص طور پر دلچسپی

پینے لگے تھے جہاں دعوت اسلامی نے بھی اچھی طرح پاؤں نہیں جمائے تھے۔ چنانچہ ان کے اقوال بڑھا چڑھا کر پیش کیے جانے لگے اور ان کی جانب ایسی آراء منسوب کی جانے لگیں جن کے یہ خود بھی قائل نہ تھے۔ حضرت معاویہؓ، جو اس وقت شام کے گورنر تھے، حضرت ابوذرؓ کی مہم سے بڑے تنگ آ گئے اور انہیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر یہ دعوت یونہی برقرار رہی تو ایک روز یہ ایسی طالع آزما کشمکش پر منتج ہو گی جسے موالی، پسماندہ طبقہ کے لوگ اور مفتوح علاقوں کے زخم خوردہ افراد برپا کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس یہ شکایت بھیجی۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو مدینہ طلب کر لیا اور ان کے خیالات معلوم کیے اور جب ان پر یہ واضح ہو گیا کہ ابوذرؓ کی دعوت میں بہت بڑا خطرہ مضمر ہے تو آپ نے حضرت ابوذرؓ کو ربذہ نامی ایک الگ تھلگ بستی میں جلاوطن کر دیا اور اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا۔

دعوت ابوذرؓ سے عام صحابہ کا اختلاف خلیفۂ ثالث کی طرف سے یہ ایسا کارگر اقدام تھا کہ اس کے بغیر کوئی صورت اسلام کے نظام حکومت کو اور شریعت مطہرہ کو بچانے والی نہ تھی۔ شریعت کا یہ مسلّم اور محکم اصول ہے کہ وہ شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرتی ہے اور دولت کو ساجھے کی ہنڈیا بنانے کے بجائے وہ انسانی جان کی طرح اس کی حفاظت لازم ٹھہراتی ہے۔ البتہ خزانۂ ریاست وہ مشترکہ کھاتہ ہے جہاں سے ہر شخص اپنے مرتبہ و ضرورت کے مطابق اپنا حق وصول کرنے کا مجاز ہے۔ یا مالِ زکوٰۃ ہے جو شریعت نے صرف فقراء و مساکین کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں شریعت تمام لوگوں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ جائز طریقوں سے اپنی دولت و ثروت کی افزائش کریں۔ اور اگر وہ اپنے اوپر عائد شدہ حقوق و فرائض کو ادا کرتے رہیں تو وہ کسبِ مال کے لیے جس قدر چاہیں اپنے ذرائع و وسائل پھیلاتے جائیں۔ یہی بنیاد تھی جس کے پیش نظر تمام صحابہؓ نے حضرت ابوذرؓ کے مسلک سے براءت کا اظہار کیا۔ حضرت ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے: کل ما ادیت زکاتہ فلیس بکنز ولو کان تحت سبع ارضین (جس مال کی تو نے زکوٰۃ ادا کر دی ہو وہ کنز نہیں ہے، خواہ اسے سات زمینوں کے نیچے دبا رکھا ہو)۔ ہاں، بذل و سخا اور احسان و عطا کے میدان میں مسابقت کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی بلکہ

مطلوب و مستحسن یہ ہے کہ مسلمان اس میدان میں بڑھ چڑھ کر ریکارڈ توڑیں لیکن یہ مطالبہ بر سبیلِ ترغیب و تشویق ہے نہ کہ بذریعہ جبر و اکراہ۔

صاحبِ ثروت صحابہ کا جذبۂ انفاق کتاب و سنت میں انفاق فی سبیل اللہ کے لیے اور کمزوروں اور ناداروں کی مواسات کے لیے جو کچھ ترغیبات مذکور ہیں یا بخل و تنگدلی سے جیسی کچھ نفرت دلائی گئی ہے اس سے کوئی شخص ناواقف نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے انہی ترغیبات کو عزیمت پر محمول کیا اور اصل حکم قرار دیا لیکن دوسرے صحابہ —— جن میں خلفائے راشدین بھی تھے اور عشرہ مبشرہ بھی —— ان کی اس توجیہ کے خلاف تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ میں زبیر بن عوام اور عبدالرحمٰن بن عوف جیسے بڑے بڑے صاحبِ ثروت لوگ بھی تھے لیکن ان کا حال یہ تھا کہ جب انہیں صدقہ و خیرات کی دعوت دی جاتی تو وہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اپیل پر یکبارگی اپنا تمام سرمایہ حاضر کر دیتے ہیں اور جب حضورؐ ان سے دریافت فرماتے ہیں کہ ما ترکت لاولادک؟ (بال بچوں کے لیے کیا چھوڑا ہے) تو وہ جواب دیتے ہیں: ترکت لھم اللہ ورسولہ (اللہ اور رسول ان کے پاس چھوڑ آیا ہوں)۔ عمرؓ بن خطاب اپنی تمام پونجی کا نصف پیش کر دیتے ہیں۔ اور حضرت عثمانؓ —— جنہوں نے حضرت ابوذرؓ کے مقابلے میں سرمایہ داروں کی حمایت کی تھی —— دعوتِ اسلامی کی کامیابی کے لیے اتنا مال بارگاہِ رسالت میں نچھاور کر دیتے ہیں کہ اسے احاطۂ شمار میں لانا دشوار ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ پورے کا پورا لشکر (جیش العسرۃ) صرف اپنے مال سے تیار کر دیتے ہیں اور بارگاہِ نبوت سے ان کو یہ اعزاز عطا کیا جاتا ہے کہ ما ضر عثمان ما فعل بعد الیوم (آج کے بعد عثمان جو کچھ بھی کریگا اسے نقصان نہیں پہنچے گا)۔

دونوں خلیفوں کے بروقت اقدام کی اہمیت میرا مدعا یہ ہے کہ اسلام، جو ہر صاحبِ حق کو اس کا پورا حق عطا کرتا ہے اور بے لچک سرمایہ داری اور انتہا پسند سوشلزم کے بین بین اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اسے اپنی دونوں آزمائشوں کے موقع پر دونوں خلیفوں کی ذات میں اپنی اقدار و ممیزات

کے دو بہترین پاسبان میسّر آگئے ۔ جونہی مالدار طبقہ نے فقرا و مساکین کو ان کے حقوق سے محروم کر دینے کی دھمکی دی خلیفۂ اوّل یکایک اُٹھے اور ان کی حمایت میں مالداروں کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا ۔ دوسری طرف جب اغنیاء کے خلاف طبقہ فقراء کے غلط تصورات نے خطرے کا الارم بجایا تو خلیفۂ ثالث اغنیاء کا جانبدار ہو کر فقراء کے انقلابی عزائم سے ان کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے انتہا پسند مسلک کی بروقت سرکوبی کر دی ، جو اگر کامیاب ہو جاتا تو معاشرۂ اسلامی کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتا ۔ انتشار و فوضیت کا طوفان برپا ہو جاتا اور زمامِ حکومت پر فتنہ پردازوں کا قبضہ ہو جاتا ۔

خوارج کا فتنہ اور اس کا استیصال آگے چل کر اسلام پھر خلیفۂ مظلوم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایامِ خلافت میں ایک خطرے سے متصادم ہو جاتا ہے جس کی سنگینی اور ہلاکت خیزی نے سابقہ تمام خطرات کو مات کر دیا ۔ یہ خوارج کا فتنہ تھا جو صرف اسلامی ریاست کے مالیاتی نظام کے تار و پود بکھیرنے تک اکتفا کرنے والا نہ تھا بلکہ جس کے بطن میں ملتِ اسلامی کے سیاسی ، معاشرتی اور فکری ڈھانچے کا مکمل تیا پانچہ کر دینے کا سامان موجود تھا ۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے پورے دورِ خلافت میں خوارج کی سرکوبی میں کبھی تردّد سے کام نہیں لیا بلکہ ہمیشہ ان کے خلاف معرکۂ قتال گرم رکھا ، حتیٰ کہ آپ دین کی پاسبانی اور ملت کی شیرازہ بندی کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے ۔ اب حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کو تو صحیح سمجھتے ہیں لیکن ملتِ اسلامی کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والوں کے خلاف تلوار اٹھانے سے انہیں اتفاق نہیں ہوتا ، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الثانی منھما (جب دو خلیفوں کی بیعت تک نوبت پہنچ جائے تو دوسرے کی گردن اڑا دو) اور نہ ہی دینِ حق کے اندر ایسے افکار و نظریات تراشنے والوں کے خلاف ان کی رگِ حمیت میں حرکت آتی ہے ، جن کی کتاب و سنت میں کوئی سند نہیں ہے ۔ حالانکہ شارع علیہ السلام کا فیصلہ ہے کہ من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو ردٌّ (جس نے دین میں کوئی ایسا طریقہ جاری کر دیا جو اس میں نہیں ہے تو اُسے رد کر دیا جائے گا) ۔ حضرت علی خواہ حینِ حیات فتنۂ خوارج کے مہلک جراثیم کا عملی طور پر قلع قمع نہ کر سکے ، لیکن

بحیثیت نظریہ آپ نے ان کی جڑ کاٹ دی۔ چنانچہ یہ اُن کے طرزِ عمل ہی کے اثرات ہیں کہ اُن کے بعد ہر دَور کے مسلمان ہمیشہ خوارج کے خلاف شمشیر برہنہ رہے ہیں۔ اور اسلامی پلیٹ فارم پر انہیں جگہ دینے کے کبھی روادار نہیں ہوئے ہیں۔ تاریخ کی شہادتیں موجود ہیں کہ اہل السنتہ والجماعتہ کے جھنڈے تلے خوارج کو کبھی پناہ نہیں مل سکی اور نہ اسلامی خلافت کے کسی دَور میں ان کی دال گل سکی۔

معتزلہ کا ظہور اور علماء کا ابتلاء خوارج کا اختلاف متعدد گمراہ فرقوں اور مسلکوں کو جنم دینے کا موجب ہوا، جیسے قدریہ، جبریہ اور مرجئہ وغیرہ۔ پھر انہی مذاہب کی تراش خراش سے ایک آخری گروہ برآمد ہوا جسے معتزلہ کہا جاتا ہے۔ ان فرقوں نے اپنے افکار کی تشہیر کے لیے تلوار کا استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ایک نظریاتی جنگ چھیڑ دی۔ چنانچہ علمائے اسلام اور ائمہ سنت اٹھے اور ان کے افکار فاسدہ کے مسموم تیروں سے قلعۂ اسلام کی حفاظت میں لگ گئے۔ اور ان کے تیروں کو انہی کے سینہ و جگر میں پیوست کرنے لگے۔ چنانچہ یہ علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ان مذاہب پر ہمیشہ مُردنی چھائی رہی ہے۔ پوری تاریخ میں صرف چند ایسے مواقع ملتے ہیں جن میں ان کو بعض حکمرانوں کی حمایت حاصل ہو جاتی رہی ہے۔ جو ان پر کچھ دیر کے لیے چہل پہل پیدا کر دیتی تھی لیکن آخر کو خزاں زدہ ہو جاتے رہے ہیں۔ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ انجام کار علمائے اسلام نے ان پر ایسی ضرب کاری لگائی کہ سوائے تاریخ کے فرقوں کے اور ملل و نحل کی کتابوں کے ان کا کہیں ذکر تک نہیں چھوڑا اور صدیاں گزر گئی ہیں لیکن ان کے پیرِکاروں کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ حالانکہ وسیع پیمانے پر ان کی اشاعت کی گئی اور امراء و حکام کا ایک گروہ بھی ان کے دامِ فریب میں آکر ان کی پشت پناہی کرتا رہا ——— دراصل اس وقت اسلامی حمیّت زندہ تھی اور یہ اُسی کا کرشمہ تھا کہ اسلام کے جلیل القدر ائمہ فکر ان مذاہب کے خلاف معرکہ آزما رہے اور انہوں نے فلسفہ و کلام کی فیصلہ کن جنگ لڑی جس کی وجہ سے ان حضرات کو گہرے زخم بھی آئے اور ناقابلِ برداشت اذیتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے بڑے دل گردے کے ساتھ سب کچھ برداشت کیا ——— یہ غیرتِ دین ہی کی تپش تھی کہ انہوں نے ان تجدد پسندانہ افکار اور گمراہ کُن نظریات کی جڑ کاٹ کر قیامت تک کے لیے انہیں پیوندِ خاک کر دیا۔ اور بالآخر دعوتِ

اسلامی کا پرچم اپنی اصل اقدار و خصوصیات کو جلو میں لیے دنیائے اسلام پر لہرا تا رہا۔

مزید آزمائشیں ان کلامی معرکوں میں کیسے کیسے تلخ مجادلے و مناظرے ہوتے رہے یا یہ اعتزالی افکار رسول کی تعلیم سے کس حد تک منحرف تھے اور عقیدۂ اسلام کے لیے کیا کیا خطرات اپنی آستینوں میں رکھتے تھے یا سلف صالحین کے دینی اور دنیوی طریقوں سے کہاں کہاں متصادم ہوتے تھے؟ ان تفصیلات میں اگر ہم جائیں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ جسے تفصیلات درکار ہوں وہ خود ان مضامین کی کتابوں سے رجوع کر کے معلوم کر سکتا ہے۔ ہمارے لیے اس مقام پر صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہم نے حاصل بحث کے طور پر، علماء کا وہ زبردست موقف بیان کر دیا ہے جو انہوں نے ائمۂ ضلالت کے مقابلے میں اختیار کیا تھا۔ ہم یہاں قرامطہ کی فتنہ انگیزیوں، صلیبی معرکوں اور تاتاری یورشوں کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ یہ حوادث دینی و مذہبی سے زیادہ سیاسی و عسکری رنگ میں رنگے ہوئے تھے اگرچہ انہوں نے بھی عالم اسلامی میں تہلکہ مچائے رکھا تھا۔ اور اسلامی تہذیب کے ان گنت نقوش کھرچ کر رکھ دیئے تھے۔ اور اسلام کا کارواں مدت تک جمود کی وادی میں پڑا رہا۔ یہ حوادث اپنے رنگ ڈھنگ کے لحاظ سے یورپ کی فکری و تہذیبی یلغار سے کافی مشابہت رکھتے ہیں جو گزشتہ صدی کے اواخر اور قرن حاضر کے اوائل میں بلادِ اسلام پر وارد ہوئی۔ ان دونوں میں صرف ایک فرق ہے جو بجائے خود بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہی دراصل اس مقالے کا موضوع ہے۔

دنیائے اسلام کا استعمار سے اعجازی جہاد صدیوں کی نیند کے بعد جب مسلمانوں نے آنکھیں کھولیں تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی دنیا ہی بدل چکی ہے غیر ملکی حملہ آوروں کے لشکر ہیں جو ان کے شہروں اور بستیوں میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ دشمن کے جھنڈے ہیں جو ان کے ارض و سما پر لہرا رہے ہیں استعمار کا کلمہ ہے جو ان کی سرزمین میں پڑھا جا رہا ہے۔ اس استعمار نے بظاہر حمایت اور سرپرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے مگر اس کا اصل سہارا سنگین ہے۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کو اپنی اس ابتر حالت پر صبر نہ رہا اور انہوں نے نئے حملہ آور کے آگے جبہ سائی سے انکار کر دیا۔ ان کے اندر استعماری اقتدار کے خلاف وہ جس نام سے بھی موسوم تھا اور جس امپیریلسٹ ملک سے بھی تعلق رکھتا تھا، بغاوت کا آتش فشاں

پھوٹ پڑا جس نے استعمار کی ستمگر قوتوں کو روند ڈالا۔ اس کے نظم و نسق کو تلپٹ کر دیا اور اس کے ہیبت ناک ساز و سامان کو پھونک ڈالا۔ انھیں پھر بھی چین نہ آیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے نئے حملہ آوروں کو سمندر کی لہروں تک پہنچا کر دم لیا۔ اور اپنے نام نہاد حامیوں اور اوپر سے ٹھونسے ہوئے سر پرستوں اور تمام سامراجی فرمانرواؤں پر عظیم الشان کامیابی حاصل کر لی۔ یہ کامیابی مسلمانوں کی ایمانی قوت اور یقینِ صادق کا کھلا ثبوت تھی کیونکہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف دشمن نوع بنوع جنگی ساز و سامان اور آتشیں اسلحہ سے لدا ہوا تھا اور دوسری طرف مسلمان مادی افلاس میں گھرے ہوئے تھے اسلحۂ جنگ اور سامانِ حرب سے بالکل خالی تھے تو ان دونوں کے مقابلے کی کوئی توجیہ ہی نہیں کی جاسکتی۔ معلوم ہوا کہ کامیابی کا اصل سہرا دینی غیرت و حمیت اور اسلامی روح کے سر پر ہے جس سے ملتِ اسلامی سرشار تھی۔ وہی روح جو ذلت و رسوائی کی زندگی پر کبھی رضا مند نہیں ہوسکتی اور مقامِ عزت کے سوا کسی مقام سے آشنا نہیں۔ وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین۔

سامراج کا فکری استیلاء لیکن عہدِ استعمار کا تصفیہ اور اجنبی تسلط کا انخلاء مکمل طور پر عمل میں نہیں آیا۔ اسلامی معاشرے پر سامراجی لشکروں کے جلو میں مختلف فکری و نظری بیماریاں بھی حملہ آور ہوئیں ان بیماریوں نے قوم کے نوجوان دل و دماغ میں گھر کر لیا اور تعلیم یافتہ عنصر کے فکر و نگاہ میں ڈیرہ ڈال کر انڈے بچے دینے شروع کر دیئے۔ اور اب اسلامی ممالک اجنبی تسلط و استبداد سے گلو خلاصی کرانے کے باوجود بھی ان بیماریوں سے نجات نہیں پا رہے ہیں۔ یہ بیماریاں وہ باقیات السیئات ہیں جو کہ خوب پھیلی ہوتی ہیں۔ نظامِ حکومت میں ان کا غلبہ ہے، تعلیم پر یہ چھائی ہوئی ہیں۔ اقتصادیات کی گردن ان کے ہاتھ میں ہے۔ گھریلو زندگی سے لے کر اجتماعی اور بین الاقوامی نظام پر ان کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ فرد کی حرکت ہو یا جماعت اور ریاست کی سرگرمی، سب پر انہی کی عملداری ہے حاصل یہ کہ ان کی جڑیں گہرائیوں تک اتری ہوئی ہیں اور شاخیں انتہائی بلند و بالا۔ اب خواہ سعی و جہد کا کتنا ہی سرمایہ ان کے ازالہ پر جھونکا جائے ان کا استیصال دشوار نظر آتا ہے الا یہ کہ نژادِ حاضر —— جو مغرب و تہذیبِ مغرب کی پکی مومن اور اس کے ماسوا کی پکی کافر ہوچکی ہے —— بساطِ عالم سے

رخصت ہو جائے۔

شیوۂ مغلوب | مغربی تہذیب و ثقافت پر شیفتگی نے موجودہ نسل پر غور و فکر کے تمام دروازے مسدود کر دیئے ہیں۔ اور وہ آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر مغربی مظاہر حیات کی نقالی کیے جا رہی ہے۔ لیکن اس ناپیدا کنار گرویدگی اور اندھی تقلید کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ "استاذ" کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے جائیں اور تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کر لیا جائے۔ ہمارے ماہرِ اجتماعیات فیلسوفِ اسلام ابنِ خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس امر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ مغلوب غالب کی تقلید کا رسیا کیوں ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں موصوف نے اندلسی مسلمانوں کی اس حالت کی مثالیں بھی بیان کی ہیں جو مغلوبیت اور ذلت کے بعد ان پر طاری ہو گئی تھی۔ موصوف رحمہ اللہ زوالِ اندلس کے وقت موجود نہیں تھے لیکن انہوں نے اسباب و عوامل کی نشاندہی کر کے اس کے زوال کی پیش گوئی کر دی تھی۔ کیا اب اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دنیائے اسلام آج بھی اُسی تجربہ سے گزر رہی ہے جس سے اندلس گزر چکا ہے اور یہ بھی انجام کے اُسی گڑھے کی نذر ہو گی جس کی نذر اندلس ہو چکا ہے؟!

مسلمانوں پر کیا بیتنے والی ہے؟ | بے شک آج اسلام کی حالت اندلس سے بھی بدتر ہو چکی ہے لیکن مسلمان اُس وقت جس طرح وطن سے نکال پھینکے گئے تھے آج اُسی طرح اپنے ممالک سے نہیں نکالے جائیں گے ۔۔۔ اگرچہ المیۂ فلسطین کو دیکھ کر یہ بات بھی زیادہ اطمینان سے نہیں کہی جا سکتی ۔۔۔ لیکن ان پر جو بیتنے والی ہے، بلکہ بالفعل جو بیت رہی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کو پناہ گاہِ مذہب سے نکال دیا جائے گا اور جن شعائر و مظاہر کی بدولت وہ دوسروں پر امتیاز رکھتے ہیں وہ ان سے چھین لیے جائیں گے، اور اسلام کا حلقہ ان کے گلے سے آہستہ آہستہ سرکا لیا جائے گا۔ ان کے ہاتھ کوئی چیز نہیں رہ جائے گی بجز ان تنگ نظر قومیتوں کے جن کے خمیر میں اتحاد سے زیادہ افتراق کا عنصر ملا ہوا ہے انہی قومیتوں کی شر انگیزیوں سے وہ ایک دوسرے کے ۔۔۔ غیروں کی مدد سے یا اپنے ہی بل بوتے پر ۔۔۔ گلے کاٹنے لگیں گے لیکن اس کے بعد وہ کسی شمار و قطار میں نہیں رہیں گے اور اگرچہ ان کی سرزمین سے سامراج کی بساط لپٹ چکی ہے لیکن بایں ہمہ اس کا جُوا ان کی گردنوں پر باقی

رہے گا۔

مغربی نظریاتِ حکومت کا جادو سامراجی بیماریوں میں سے سب سے پہلے جس بیماری نے مسلمانوں کے فکر و نگاہ پر یلغار کی ہے وہ نیشنلزم ہے اس بیماری کے اثرات اس وقت نمایاں ہوئے جب اسلامی ممالک نے استعمار کی سیاسی گرفت سے نجات حاصل کر لی — جو کہ دینی جذبات و احساسات کی بدولت حاصل ہوئی نہ کہ نیشنلزم کی کرامت سے اس حقیقت سے خود ترکی کا انقلاب بھی انکار نہیں کر سکتا — اور ان کے سامنے نظامِ حکومت کا مسئلہ درپیش ہوا تو مغربی نظامہائے حکومت کا طلسم ہوشربا آگے بڑھا اور نیشنلزم کے ڈسے ہوئے مسلمانوں کے فکر و نگاہ کو مسحور کر گیا۔ چنانچہ کوئی ڈیموکریسی کا دلدادہ بن گیا کسی کو سوشلزم خیرہ کر گئی، کسی کو کمیونزم کی پری نے اپنے شیشے میں اتار لیا اور کوئی ابھی مرحلۂ انتخاب میں ہے۔ رہا اسلامی نظامِ حکومت تو اُسے کسی رہنما اور کسی لیڈر کے حاشیۂ خیال تک میں بھی شرفِ باریابی نہ مل سکا۔ اور اب نام نہاد مسلمان خود نظریۂ اسلام اور دستورِ قرآن کے چہرے کو بھی داغدار کر رہے ہیں اور اسے بھی درآمد شدہ اصطلاحات کا جامہ پہنانا شروع کر دیا ہے۔ ایک صاحب "اسلامی ڈیموکریسی" کا ذکر کر رہے ہیں، دوسرے "اسلامی سوشلزم" کا انکشاف کر رہے ہیں۔ اور وہ دن بھی آیا چاہتا ہے کہ ہمارے کان "اشتراکی اسلام" کا چرچا بھی سننے لگیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر خود مغربی ڈیموکریسی اور اس کے مختلف اسکولز آف تھاٹ کو اسلام سے مشابہت دی جاتی تو یہ بھی اسلام پر بہت بڑی بہتان تراشی ہوئی۔ کجا کہ وہ نظامِ حکومت جو اعلیٰ اقدار و برتر خصوصیات میں یکتائے عالم ہے۔ اسے ڈیموکریسی اور سوشلزم وغیرہ ... سے تشبیہ دی جائے۔ قیاس کیجیے جس نظامِ حکومت کا رشوت کے سوا کوئی ضمیر نہ ہو اور مصنوعی انسانی امتیازات کے سوا کوئی قانون نہ ہو کتنا بڑا جرم ہوگا کہ اُس کا ایسے نظام سے موازنہ کیا جائے جو صہیبؓ، بلالؓ اور سلمانؓ کو ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کے برابر کھڑا کرتا ہو۔

یورپ کی عاجزانہ نقالی ایک قدم آگے بڑھیے، پورے عالم اسلامی میں جب اسلامی نظامِ حکومت کے لیے دروازے بند کر دیئے گئے، تو اب ہمارے بھائیوں کو ملک کے لیے فوجداری و دیوانی

قوانین کی احتیاج لاحق ہوئی چنانچہ انہیں اس میں کوئی تردد نہ ہوا، فوراً لپکے اور مغرب کے قوانین سے اور مغرب کے مجلہ ہائے احکام سے اخذ و اقتباس شروع کر دیا۔ بلکہ لفظ بہ لفظ نقل مارنے لگے ــــ کیونکہ جیسا کہ میں پہلے گزارش کر آیا ہوں، کم کوشی اور بے بسی نے ان کے اندر اخذ و اقتباس کی اہمیت بھی باقی نہیں رہنے دی انہیں صرف مکھی پر مکھی مارنا آتا ہے اور نوبتِ تقلید بایں جا رسید کہ وہی حاکم جو پہلے "اللہ کے نام سے" فرمان صادر کرتا تھا۔ اب غیر اللہ کے نام سے صادر کرنے لگا ــــ کیوں ؟ اس لیے کہ استاذ مغرب نے اپنے قوانین سے دین و عقیدہ اور سماوی شریعت کو فارغ خطی دے دی ہے نقال جو اپنے استاد سے گیا گزرا ہوتا ہے کیوں نہ ایسا کرتا ! ــــ صرف ایک "الجھن" اس دستبرد سے محفوظ رہ گئی۔ یہ پرسنل لا کی الجھن ہے غیر ملکی حکمران نے پرسنل لا کو (اپنے مصالح کے پیش نظر) درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اس لیے اس کی قانون سازی اور دفعات بندی نہیں کی بیچارے مسلمانوں کو یہ کوہ کنی خود ہی کرنی پڑی اور پرسنل لا کی ترتیب و تبویب کا فرض خود ہی انجام دینا پڑا۔ اور یہی وہ خدمت ہے جس پر مسلمان جامے سے باہر ہو گئے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں "ہم نے اسلامی قانون کے اندر عظیم ترین اصلاحات کی ہیں . . . . اور یہ بیچاری مسلمان عورت، جس کے حقوق چھن چکے تھے اور جس کی آبرو کو بٹہ لگ چکا تھا، ہم نے اُسے عدل و انصاف سے بہرہ مند کیا ہے۔"

ترقی نسواں کا دعویٰ اور اس کی حقیقت تسلیم کہ مسلمان عورت کے حقوق چھین لیے گئے تھے اور اس کی آبرو کو بٹہ لگ چکا تھا۔ لیکن کب ؟ ــــ جب آپ کی عدل گستری اور انصاف پروری کا سایہ اس پر پڑا ! ۔ وہ وقت بھی تھا کہ بلادِ اسلامیہ میں کوئی مظلوم بیوہ نہ ملتی تھی اور کوئی دوشیزہ حرماں نصیبی کی زندگی نہ گزار رہی تھی۔ اور (آپ کی "اصلاحات" کے بعد) یہ وقت بھی ہے کہ ممالکِ اسلامیہ نظر فریب تہذیب کے علم بردار ممالک کے اُسوہ میں ایسی عورتوں سے بھرے پڑے ہیں جو خاوندوں کی سرپرستی سے محروم ہیں۔ پہلے دوشیزہ کی جستجو ہوتی تھی اور آج دوشیزہ خود خاوند کی جستجو میں ماری ماری پھرتی ہے۔ پہلے پاکیزگی اور طہارت اسلامی معاشرے کا شعار تھے، آج فسق و فجور اور ازدواجی خیانت اس کی طبیعت ثانیہ بن چکے ہیں۔ مسلمان خاتون ــــ جو تر و تازہ اچھوتے شگوفے کے مانند تھی

جس کی طرف مجرمانہ ہاتھ تو کجا، نگاہِ بد تک اٹھائی نہیں جا سکتی تھی ـــــ اب مجالسِ فسق اور رقص پارٹیوں کی روح رواں بنی ہوئی ہے۔ جب باہر نکلتی ہے تو ساق و سینہ کی عریانی دعوتِ نظارہ دے رہی ہوتی ہے۔ جسم کے فتنہ انگیز حصے بھڑک رہے ہوتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم اور اسلام کے راستے سے کھلم کھلا انحراف ہوتا ہے اور آڑ لی جاتی ہے شخصی آزادی کی، ترقی و بیداری کی اور ترکِ حجاب کی، درآنحالیکہ حجاب شہری عورتوں کی عام عادت میں داخل تھا جسے انہوں نے شر و فتنہ سے بچاؤ کے لیے بطور سپر اختیار کیا ہوا تھا اور ایک غیر شناسا لباس ہوتا تھا جسے شریف خواتین قضائے حاجت کے وقت شر پسندوں اور چھچھوروں کے تعرض سے محفوظ رہنے کے لیے پہننے پر مجبور ہوتی تھیں۔ لیکن یہ عریانی و نمائش، یہ بدکاریاں اور یہ مرد اور عورت کا باہوں میں باہیں ڈال کر چلنا، یہ رقص و سرود ان کی روادار نہ شریعتِ اسلام ہے اور نہ قانونِ اخلاق۔

دینی تعلیم کی زبوں حالی تعلیم کے میدان میں کیا ہو رہا ہے؟ ـــــ لادینیت تعلیم کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں گھس چکی ہے۔ اور ہم دینی تعلیم کو دنیوی تعلیم کے اندر مدغم کرنے کے لیے سب انسانوں سے زیادہ آرزومند ہیں۔ اور دنیوی تعلیم کا یہ حال ہے کہ دین کے نظری اور عملی اصولِ تربیت سے بالکل بے حظ ہو چکی ہے۔ دینی تعلیم کے ادارے جن دنوں سامراجی بغض کا ہدف بنے ہوئے تھے انہیں روحِ آزادی پھونکنے والے خیالات کے قلعے اور زبان و ادب کے آشیانے سمجھا جاتا تھا، وہی آج ان کم کوشوں اور کوتاہ ہمتوں کی نگاہ میں غداری کے گڑھ اور قدامت پرستی کی پناہ گاہیں قرار پا چکی ہیں۔ ان کے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا تمسخر اڑاتے ہیں اور ان کے وابستگان کی ہر موقع و مناسبت سے پگڑی اچھالی جاتی ہے۔

سود اور دیگر محرمات کا عام چلن اقتصادی اور مالیاتی نظام کے بارے میں تو دنیائے اسلام نے مغربی نظریات کی پیروی کی قسم اٹھا رکھی ہے۔ اور خاص طور پر ان سرمایہ دار آبادیوں کی تقلید کی جا رہی ہے جن کی سج دھج احتکار، استحصالِ زر اور شرمناک معاشی لوٹ کھسوٹ پر قائم ہے اور تمام تر بوجھ پسماندہ طبقات اور صارفین کی گردنوں پر ہے اور سودی کاروبار کے ذریعے، قمار خانوں

کے لیے لائسنس جاری کر کے اور "پاکیزہ" و "غیر پاکیزہ" تفریح گاہیں قائم کر کے دولت جمع کی جاتی ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود یورپ کے مشرقی ممالک میں سود کاری ممنوع ہے۔ بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں قمار بازی ناجائز ہے۔ اور امریکہ میں تو ہوور کے عہدِ صدارت میں شراب بھی ممنوع قرار دے دی گئی تھی اور اس کے بعد اس ممانعت کو جن اسباب کی بنا پر ختم کیا گیا ہے ان کا تعلق نظریۂ تحریم سے نہیں ہے لیکن ہمارے ملک میں اگر کوئی قانون ساز جرأت کر کے مے نوشی کی ممانعت کے لیے بعض شرعی احکام طے بھی کر دے تو مسلمانوں کو مے فروشی سے روک دینا اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ حالانکہ شارع علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ان اللہ اذا حرم شیئاً حرم ثمنہ (جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام ٹھہرا دیتا ہے)۔ بات اتنی ہی نہیں، بلکہ ملک کے اندر یا باہر جب کبھی کسی پارٹی کا اہتمام کیا جاتا ہے تو اس کا سب سے بڑا عنصر شراب ہوتی ہے۔ اسلام خواہ اپنی کتنی ہی ناک رگڑتا رہے مگر یہ لوگ (مقلدینِ مغرب) اہلِ کفر کی خوشنودی کے لیے —— استغفراللہ! —— بلکہ اپنی بدترین نفسانی خواہش کی تسکین اور آتش بلانوشی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے شاملِ تفریح کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرے ایک دوست م۔ کوبی نے، جو ہالینڈ کے مسلمان ہیں، مجھے بتایا کہ ہالینڈ کے دارالحکومت میں ایک بار وہاں کے مسلمانوں نے ایک مسلمان سفارت خانے میں شراب کا دَور چلتے دیکھا تو اس پر اعتراض کیا۔ سفارت خانے کی طرف سے انہیں یہ جواب دیا گیا کہ "شراب کا اہتمام غیر مسلم شرکاء محفل کی خاطر داری کے لیے کرنا پڑتا ہے"۔ مسلمانوں نے کہا "آخر اسرائیلی سفارت خانہ اپنی پارٹیوں میں خنزیر کا گوشت کیوں نہیں پیش کرتا کیا وہ دوسروں کی خاطر داری سے نابلد ہے۔ بلکہ خود غیر مسلموں کو جس قدر ان کا پاسِ خاطر ہے تمہارا ان سے زیادہ نہیں ہے؟

اصلاح کے سنگہائے راہ | یہ ہے وہ روگ جو دورِ حاضر نے اسلام کو دیا ہے۔ اور اس روگ سے اسلام کے افاقہ کی اس وقت تک کوئی امید نہیں کی جا سکتی جب تک دنیائے اسلام میں بست و کشاد کی کنجیاں اس اسلام اور مسلمانوں سے "اجنبی" نسل کے ہاتھ میں رہیں گی اور یہ بدطینت دم چھلے چھلائے رہیں گے جنہیں خود اعدائے اسلام نے پال پوس کر رکھا ہوا تھا تاکہ خطرات کے موقع پر ان کو ڈھال بنا کر

اپنی مدافعت کر سکیں۔ اور اسلام کا منبع یہی ہے کہ اس کے اصولوں کا غلط تصور قائم کر لیا گیا ہے اور اس کے چند احکام کا ادھورا نفاذ کر کے بعض نام نہاد مسلمان اہلِ ایمان کے گروہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اسلام پسند مصلحین اور دیندار مجددین کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

موجودہ بگاڑ کی اہمیت اور دعوتِ جہاد ماضی میں تو مسلمان پیش آمدہ خطرات کو فوراً بھانپ جاتے تھے اور یکسو ہو کر ان کا سدِ باب کر دیتے تھے۔ لیکن اب شیطان نے تلبیس کی ایسی چال چلی ہوئی ہے کہ وہ چیزوں کو غلط لیبل لگا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور شیطان کا ایجنٹ انارکسٹ گروہ مسلمانوں کے اندر اپنے مکر و فن کے جال پھیلائے ہوئے ہے۔ ان کے اخلاق کو بگاڑ رہا ہے اور ان کی ہمتوں کو پست کر رہا ہے۔ چنانچہ اب مسلمانوں کی اکثریت بندگیٔ نفس میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اور وہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جو اس کی ہوس کی تائید نہ کرتی ہو۔ اسی کمزور پہلو نے انہیں گرفتار معصیت کر رکھا ہے۔ ورنہ اگر یہ حوصلوں کے مضبوط ہوتے تو شیطان کے جال اور ملحدین کے پروپگنڈے کا شکار نہ ہو جاتے۔ حالات اب نزاکت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کو سنبھالنے کے لیے مؤثر اقدام کرنا چاہیے۔ دینی رہنماؤں اور داعیوں کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو سر پر منڈلانے والے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے اپنی فوج کو منظم کریں اور لاگ لپیٹ رکھے بغیر لوگوں پر واضح کر دیں کہ جس روش پر اب وہ چل رہے ہیں وہ اسلام سے ہٹی ہوئی ہے اور اگر وہ فی الواقع دین کی رسّی کو تھامنے کا پختہ عزم رکھتے ہیں تو اپنے سلف صالحین کی زندگیوں کی جانب رجوع کریں اور اپنی خواہشاتِ نفس کو تج کر از سرِ نو امانتِ اسلام کا بار اٹھانے کی تیاری کریں، اس راہ میں ان تمام چیزوں سے دستبردار ہونا پڑے گا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اور اسلام کی شوکتِ رفتہ کو زندہ کرنے اور اللہ کا بول بالا کرنے کی نیت سے انہیں مال و جان کی بازی لگا دینا ہو گی —— اور اُس دن انہیں یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے وطن کی آزادی اور اپنی قوم کی نجات پر فخر کر سکیں۔ ویومئذ یفرح المؤمنون بنصر اللہ۔

مولانا مودودی کا سفرِ بلادِ اسلامی

عمان ۔ بیت المقدس ۔ قاہرہ اور دوسرے مقامات کی سیاحت

پچھلا خط ہم نے عمان پہنچ کر لکھا تھا اور صرف ابتدائی ایک دو دنوں کا حال لکھ کر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب باقی مختصر روداد سفر مختصر طور پر لکھی جا رہی ہے۔ ممکن ہے یہ خط پہنچنے کے ساتھ ہی ہم لوگ بھی پہنچ جائیں، کیونکہ اب ہماری واپسی کا وقت قریب ہے۔ لیکن اس سلسلہ کو مکمل کرنے کے لیے یہ خط مصر سے واپسی پر دمشق سے بھیجا جا رہا ہے تاکہ آپ لوگوں کو سفر کا پورا حال معلوم ہو جائے۔

عمان ہم یکم جنوری کو پہنچے تھے اور تین دن وہاں ٹھہر کر ۴ جنوری کو قدس کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان تین دنوں میں شاہ حسین سے ملاقات ہوئی (جس کا ذکر پچھلے خط میں کر چکا ہوں)، قاضی القضاۃ اور بہت سے دوسرے علماء اور با حضرات مولانا سے ملنے کے لیے آتے رہے۔ استاذ عبد الرحمٰن خلیفہ نے عمان میں اور ایک دوسرے صاحب نے زرقاء میں مولانا کے اعزاز میں دعوتیں کیں، جس میں عمان کے بہت سے نمایاں نمایاں حضرات شریک تھے۔

اس کے علاوہ کثیر تعداد میں نوجوان آتے رہے اور مختلف مسائل میں سوالات کرتے رہے۔ بعض لوگ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ سے اطلاع پا کر اردن کے دوسرے مقامات سے بھی آکر ملاقات کرتے رہے۔ صبح سے لیکر رات کے دس گیارہ بجے تک لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

قدس کی طرف ۴ جنوری کو ہم قدس کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں السّلط کے مقام پر دو ڈھائی سو کے ایک مجمع نے ہمیں روک لیا اور بے حد محبت و اخلاص اور عقیدت کے ساتھ استقبال کیا۔ موٹر سے اتار کر ایک جلوس کی سی شکل میں شہر کے اندر لے گئے اور ایک ہال میں انہوں نے جلسے کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ ان لوگوں کا اصرار تھا کہ ہم ایک پورا دن وہاں ٹھہریں۔ بڑی مشکل سے وہ ہماری معذرت قبول کرنے پر تیار ہوئے

انہوں نے مولانا سے نصیحت کی درخواست کی۔ مولانا نے چند جملوں میں نوجوانوں کو تقویٰ اور اسلام پر قائم رہنے کی نصیحت کی، جس کو پورے مجمع نے بہت ہی اہتمام اور غور سے سنا۔

السّلط سے آگے بڑھنے کے بعد ہم وادیٔ شعیبؑ سے گزرے، جو ایک سرسبز وادی ہے اور چشموں کا پانی اس میں نہر کی طرح بہتا ہے۔ اسی وادی میں ایک اونچے مقام پر حضرت شعیب علیہ السلام کا مقبرہ بنا ہوا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت شعیبؑ واقعی وہاں مدفون ہیں، لیکن اس علاقہ میں عام روایت قدیم زمانہ سے یہ چلی آرہی ہے کہ قوم شعیبؑ پر عذاب آنے کے بعد حضرت شعیبؑ یہیں تشریف لے آئے تھے۔ یہ چیز کچھ زیادہ بعید از قیاس بھی نہیں ہے، کیونکہ مدین کا علاقہ موجودہ اردن سے بالکل متصل واقع تھا، بلکہ ارضِ مدین کا شمالی حصہ تو اس وقت اردن کی مملکت میں شامل ہے۔ خود عقبہ بھی ارضِ مدین ہی کا ایک اہم مرکزی مقام تھا۔ ہم نے مقام سیدنا شعیبؑ کا فوٹو لے لیا اور آگے روانہ ہو گئے۔

اخوان المسلمون کا مدرسہ دریائے اردن پار کرنے کے بعد اریحا میں وہ مدرسہ دیکھنے گئے جو اخوان المسلمون نے فلسطین کے شہداء کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے قائم کیا ہے۔ یہ مدرسہ اخوان کے اہم تعمیری کاموں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ اس میں بچوں کو نہ صرف عمدہ اسلامی تعلیم دی جارہی ہے بلکہ مجاہدوں کی حیثیت سے انہیں تربیت بھی دی جارہی ہے۔ اس کے بعد ہم بحیرۂ لوط کے کنارے ایک کیمپ دیکھنے گئے، جہاں ۴۰، ۵۰ نوجوان اردن اور فلسطین کے مختلف حصّوں سے آئے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ وقتاً فوقتاً تین چار دن کے لیے کسی جگہ تربیتی کیمپ لگایا کرتے ہیں، جس میں عبادت اور جہاد کی تربیت ایک توازن کے ساتھ دی جاتی ہے۔ اور چند روز بالکل سپاہیانہ زندگی بسر کر کے یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے کیمپوں میں مملکت اردن کے ہر حصّہ سے نوجوان آکر شریک ہوتے رہتے ہیں۔ اس کیمپ میں ان لوگوں نے بڑی محبت اور گرمجوشی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ ظہر کی نماز ہم نے ان کے ساتھ پڑھی، اور نماز کے بعد مولانا نے چند کلماتِ نصیحت ان سے کہے اور اس کے بعد ہم قدس کے لیے روانہ ہو گئے۔

القدس میں القدس ہم تین بجے کے قریب پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ۴ بجے مولانا کے اعزاز میں ایک عصرانہ فُندق الزہراء میں دیا جانے والا ہے۔ اس عصرانہ کا سلسلہ ۴ بجے شروع ہوا اور ۶ بجے تک جاری رہا۔ اس

میں قدس کے کمشنر، رئیس البلدیہ، قاضی، علماء، فوجی کمانڈر اور حکومت کے تمام ذمّہ دار حضرات شریک تھے۔ قدس کے علاوہ الخلیل، نابلس اور دوسرے قریبی مقامات سے بھی لوگ خاص طور پر اس عصرانہ میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ سب سے پہلے استاذ کامل الشریف نے مولانا کا خیر مقدم کیا اور پھر مولانا نے مختصر الفاظ میں اس کا جواب دیتے ہوئے فلسطین اور عربوں کے دوسرے مسائل کے متعلق پاکستانی قوم کے جذبات اور ہمدردی کا اظہار کیا، جس کا تمام سامعین پر بہت اچھا اثر رہا۔

ایک رات القدس میں ٹھہرنے کے بعد ہم لوگ ۵ جنوری کو بیت لحم اور الخلیل دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیتِ لحم القدس کے جنوب میں چند میل کے فاصلہ پر ایک اہم تاریخی مقام ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ اب اس مقام پر جہاں ان کی ولادت ہوئی تھی ایک بہت عظیم الشان کنیسہ بنا ہوا ہے، جسے کنیسۃ المہد کہتے ہیں اور عیسائی دنیا کے ہر حصّہ سے لوگ اس کی زیارت کے لیے آیا کرتے ہیں۔ ہم نے اس کنیسہ میں جاکر اس غار کو دیکھا، جس کے اندر حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی تھی۔ اس غار سے بالکل متصل ایک کونے میں ایک پتھر نصب ہے جس میں ایک گول سوراخ ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اسی جگہ وہ کھجور کا درخت تھا جس کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے کہ فرشتہ نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ اس کھجور کے تنے کو ہلاؤ تو تمہارے اوپر پکی کھجوریں گریں گی۔ ہمیں حیرت تھی کہ اس سرد علاقہ میں کھجور کیسے ہو سکتی ہے، لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کہیں کہیں کھجوروں کے درخت موجود ہیں اور الخلیل میں عملاً کھجوروں کے درخت دیکھ کر ہمیں اطمینان ہو گیا۔ اس کنیسہ میں عیسائیوں نے شرک کو اس کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ جس جگہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش بتائی جاتی ہے، وہاں حضرت عیسیٰ کا ایک بچہ کی شکل میں بت بنا رکھا ہے اور اس کے قریب ایک پنگورہ بنا کر ایک سنہرے کا بت اس میں رکھ چھوڑا ہے۔ ہمارے ساتھ جو عیسائی گائیڈ یہ مقام دکھانے گیا تھا، اس نے ہمارے سامنے ان بتوں کو سجدہ کیا۔ اس کنیسہ میں عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے حصے الگ الگ ہیں۔ اور پروٹسٹنٹ فرقہ کو بالکل اچھوت بنا کر کنیسہ کے باہر صرف ایک صحن دے دیا گیا ہے جس کے اندر وہ سال میں صرف ایک مرتبہ عبادت کر سکتے ہیں۔

بیتِ لحم کی زیارت سے فارغ ہونے کے بعد ہم الخلیل پہنچے۔ اس شہر کا قدیم نام حبرون تھا اور چار ہزار

سال پہلے جب حضرت ابراہیمؑ یہاں آئے تھے، تو اس وقت بھی یہ شہر آباد تھا۔ یہ دنیا کے ان چند قدیم ترین شہروں میں سے ہے جو ہزاروں برس سے آباد چلے آرہے ہیں۔ وہاں ہم نے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اور آلِ ابراہیم کے مقابر کی زیارت کی۔ انبیاء علیہم السلام کی جو قبریں بالکل ثابت ہیں اُن میں سے ایک یہ مقبرہ ہے۔ اصل قبریں ایک غار کے اندر ہیں، جس کے اندر جانے کا راستہ بند ہے۔ غار کے اوپر ایک بہت عالیشان عمارت بنی ہوئی ہے، جس کے ایک حصّہ میں مسجد ٹھیک غار کے اوپر واقع ہے۔ اس غار میں حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ کی قبر تو بالکل ثابت ہے۔ باقی رہے حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام تو ان کی قبروں کے متعلق پورے اطمینان کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بھی صحیح ہیں۔ ہم نے یہاں ظہر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد کھانا کھا کر سیّدنا لوط علیہ السلام کا مقام دیکھنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہ مقام الخلیل سے جنوب مشرق میں بحیرۂ لوط کے قریب واقع ہے۔ یہاں ایک پہاڑی پر حضرت لوطؑ کی قبر ہے اور اس پر مسجد بنی ہوئی ہے۔ اب اس مقام کو بنی نُعَیم کہا جاتا ہے۔ اس علاقہ کے لوگوں میں یہ روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے کہ قومِ لوطؑ کی تباہی کے بعد حضرت ممدوح یہیں چلے آئے تھے۔ یہ چیز بالکل قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ پہاڑی پر سے بحیرۂ لوط بالکل سامنے نظر آتا ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب حضرت لوطؑ اس علاقے سے نکلے ہوں گے، تو انہوں نے اسی طرف کا رُخ کیا ہوگا، کیونکہ ان کے چچا حضرت ابراہیمؑ اس کے قریب ہی الخلیل میں رہتے تھے۔

بی۔ بی۔ سی کے لیے انٹرویو الخلیل سے مغرب کے بعد ہم القدس واپس پہنچے۔ اسی رات بی۔ بی۔ سی کا نمائندہ ہمارے ہوٹل میں آیا اور اس نے مولانا سے عربی زبان میں ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ انٹرویو بی۔ بی۔ سی نے لندن سے اپنے عربی پروگرام میں ایک ہفتہ بعد نشر کیا۔ (یہ انٹرویو اس رُوداد کے آخر میں درج کیا جارہا ہے)۔

بیت المقدس کے آثار دوسرے روز پورا دن ہم نے بیت المقدس کے آثار دیکھنے میں گزارا۔ سب سے پہلے آغاز مسجد صخرہ اور مسجد اقصیٰ کے تفصیلی مطالعہ سے کیا گیا۔ اس میں القدس کے مدیر الاوقاف نے ہماری بڑی مدد کی اور ایک انجینئر کو جو آج کل مسجد صخرہ کی مرمت کے انچارج ہیں، ہمارے ساتھ کر دیا، جنہوں نے پوری

تفصیل کے ساتھ ہمیں مسجد صخرہ دکھائی پھر مسجد اقصیٰ ہم نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گائڈ کی مدد سے دیکھی۔ اس کے بعد ہم وہ مقام دیکھنے کے لیے گئے، جہاں حضرت عیسیٰ پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس جگہ عیسائیوں نے ایک عظیم الشان کنیسہ بنا رکھا ہے۔ اس کنیسہ کے اندر وہ حصہ جہاں پونتس پیلاطس کی عدالت تھی، اب ایک تہ خانہ کی شکل میں واقع ہے اور اس کے پتھر وہی چلے آ رہے ہیں جو رومن عہد میں تھے۔ اس جگہ کو دیکھنے کے بعد ہم اس راستہ پر چلے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عدالت سے سزائے موت کا حکم پانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السّلام صلیب اپنے کندھے پر رکھ کر اُس مقام کی طرف گئے تھے جو صلیب دینے کے لیے مقرر تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس راستہ میں بارہ مقامات پر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تھک کر دم لینے کے لیے ٹھہرے تھے۔ ان تمام مقامات پر عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے کنیسہ بنا رکھے ہیں۔ اس راستہ سے چلتے ہوئے ہم کنیسۃ القیامہ گئے، جہاں عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ کو صلیب دی گئی اور دفن کیا گیا، اور ہمارے عقیدہ کے مطابق جہاں شُبِّہَ لَهُمْ کا واقعہ پیش آیا، حضرت عیسیٰ بچا لیے گئے اور کسی اور شخص کو ان کے شبہ میں سُولی دے دی گئی۔ یہ ایک بہت ہی عالیشان کنیسہ بنا ہوا ہے، جسے عیسائی دنیا کے قبلہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کنیسہ میں بھی عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے مختلف حصّے ہیں، جن میں وہ الگ الگ عبادت کرتے ہیں۔ اس سے بالکل متصل وہ مسجد واقع ہے جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح بیت المقدس کے موقع پر نماز پڑھی تھی۔ آج تک عیسائی اس بات کے معترف ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب فتح کے بعد اس کنیسہ میں تشریف لائے تھے اور نماز کا وقت ہو گیا تھا، تو پادریوں نے ان سے کہا تھا کہ آپ یہیں نماز پڑھ لیں، مگر انہوں نے یہ کہہ کر نماز وہاں پڑھنے سے انکار کر دیا کہ اگر میں یہاں ایک مرتبہ نماز پڑھ لوں گا تو ممکن ہے کسی وقت مسلمان اس کنیسہ کو مسجد بنانے کی کوشش کریں، اس لیے آپ نے کنیسہ سے باہر نکل کر اس مقام پر نماز ادا فرمائی، جہاں اب مسجد عمر بنی ہوئی ہے۔ اس احسان کا بدلہ جیسا کچھ صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں عیسائیوں نے ادا کیا اور اب فلسطین میں امریکہ اور انگریزوں کی طرف سے ادا کیا جا رہا ہے وہ سب کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس کنیسہ کے سلسلے میں ایک بات یہ قابلِ ذکر ہے کہ اس کے دروازے کی کنجی قدیم زمانہ سے آج تک ایک مسلمان خاندان کی تحویل میں چلی آ رہی ہے، کیونکہ

عیسائیوں کے مختلف فرقے آپس میں اس بات پر اتفاق نہیں کر سکے کہ اس کنیسہ کی کلید برداری کا شرف ان میں سے کس فرقہ کو حاصل ہو۔ آخر کار انہوں نے از خود اس بات پر اتفاق کیا کہ ایک مسلمان اس کا کلید بردار ہو۔ یہ کلید برداری کا منصب ایک ہی خاندان میں وراثتاً چلا آ رہا ہے اور پورے انصاف کے ساتھ یہ خاندان تمام فرقوں کے لیے کنیسہ کا دروازہ کھولتا اور بند کرتا ہے اور اس پر گواہی لیتا ہے کہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی ہے۔

فلسطین کا میوزیم | بیت المقدس وہ شہر ہے جس کی ایک ایک اینٹ اپنی تاریخ رکھتی ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم اس کے سارے آثار دیکھ سکتے۔ ہمارا پورا دن صرف انہی آثار کو دیکھنے میں صرف ہو گیا، جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔

۷ جنوری کا آدھا دن ہم نے متحف فلسطین (یعنی فلسطین کا میوزیم) دیکھنے میں صرف کیا، جس میں اس سرزمین کی قدیم ترین تاریخ سے لیکر آج تک کے آثار جمع کیے گئے ہیں۔ اسی کے ایک حصّہ میں وہ قدیم نوشتے جمع ہیں، جو ۱۹۴۷ء میں بحیرہ لوط کے قریب خربت قمران کے مقام پر دریافت ہوئے تھے۔ یہ نوشتے پہلی صدی قبل مسیح اور اس کے بعد کے لکھے ہوئے ہیں اور عیسائی دنیا میں ان کے دریافت ہونے کے بعد سے ایک ہلچل برپا ہے۔ ماہرین کی ایک پوری کی پوری ٹیم ان کا مطالعہ کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں لگی ہوئی ہے اور ساتھ ساتھ عیسائی دنیا کو یہ پریشانی بھی لاحق ہے کہ کہیں ان میں سے وہ مواد فراہم نہ ہو جائے جو موجودہ عیسائیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دے۔

اسی روز ہم عمّان کے لیے واپس روانہ ہو گئے، اور شام کو وہاں پہنچے۔

عمّان میں سرکاری دعوت | ہم عمّان سے جلدی ہی روانہ ہو جانا چاہتے تھے، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شاہ حسین نے حکم دیا ہے کہ مولانا کی واپسی پر مولانا کے اعزاز میں پارٹی دینے کا اہتمام کیا جائے۔ اس لیے ہمیں ایک دن مزید وہاں ٹھہرنا پڑا۔

۹ جنوری کو نادی الملک حسین (ملک حسین کلب) میں حکومت کی طرف سے قاضی القضاۃ نے (جو آج کل وزیر تعلیم بھی ہیں) ہمیں پارٹی دی، جس میں اردن کے بہت سے عمائدین شریک تھے۔ کافی دیر تک مختلف

موضوعات پر دلچسپ گفتگو ہوتی رہی اور پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق بہت مفصل معلومات مولانا نے شرکائے مجلس کو دیں۔

اصحابِ کہف کا غار اگلے روز ہم نے صبح کو وہ مقام بھی جا کر دیکھا، جس کے متعلق مقامی روایات یہ ہیں کہ اصحابِ کہف کا قصہ یہیں پیش آیا تھا۔ یہ مقام عمان سے جنوب مشرق میں ۱۱ کیلومیٹر (۸ میل) کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں ایک غار ہے جس کے اندر اتنی تاریکی ہے کہ باہر سے آدمی جھانکے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ اس غار پر اور اس سے متصل کئی جگہوں پر قدیم زمانہ کی سنگین عمارتوں کے آثار موجود ہیں، لیکن مقامی روایات کے سوا کوئی چیز کتبہ وغیرہ کی شکل میں وہاں موجود نہیں ہے، جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہی اصحابِ کہف کا مقام ہے۔

اسی روز ہم اِرْبِد کے لیے روانہ ہوئے جو اردن اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں ایک بہت بڑے مجمع نے مولانا کا استقبال کیا اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی ایک ہائی سکول کی عمارت میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں اِرْبِد کے کمشنر، جج، فوج اور پولیس کے افسر اور دوسرے عمائد شہر شریک تھے۔ کمشنر صاحب نے بادشاہ اور حکومت کی طرف سے خیر مقدم کی تقریر کی اور مولانا نے شاہ حسین اور اردنی قوم کا شکریہ ادا کیا اور ان کے مسائل میں پاکستان کی پوری ہمدردی کا ذکر کیا۔

مزاراتِ صحابہؓ دوسرے روز ۱۱ رجنوری کو ہم وہ مقامات دیکھنے گئے، جہاں حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح، حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ اور حضرت ضرارؓ بن اَزْوَر کے مزارات واقع ہیں۔ ان مزارات کو دیکھنے کے لیے اِرْبِد سے ہم کو تقریباً ۸۰ کیلومیٹر کا سفر القدس کی طرف کرنا پڑا۔ جس سڑک پر ہم گئے یہ پہاڑوں سے گزرتی ہوئی سب سے پہلے حضرت معاذؓ کے مزار تک پہنچتی ہے اور وہاں سے پھر دریائے اردن کے ساتھ ساتھ مشرقی کنارے سے بیت المقدس کو جاتی ہے۔ دریائے اردن کے مغربی کنارے پر اسرائیل کا قبضہ ہے اور مشرقی کنارے پر اس سڑک کے ساتھ ساتھ اردن میں مسلمانوں کے بڑے اہم تاریخی مقامات واقع ہیں۔ یہیں فحل کا تاریخی مقام واقع ہے جہاں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مشہور معرکہ پیش آیا تھا اور اسی سڑک پر کئی کئی میل کے فاصلہ سے مذکورہ بالا صحابہ کرام کے مزارات بنے ہوتے ہیں۔

میدان یرموک ان مقابر کی زیارت سے فارغ ہو کر ہم اِربد واپس ہوئے اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر جنگِ یرموک کا مقام دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے جو اِربد سے چند میل کے فاصلہ پر شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ اصل میدان تو شام کی سرحد میں واقع ہے، لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ اردن کی سرحد پر ایک پہاڑی پر سے کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے جس جگہ سے اسے دیکھا، وہاں دریائے یرموک ہمارے اور میدان معرکہ کے درمیان حائل تھا۔ جنگ یرموک کی صحیح کیفیت آدمی سمجھ نہیں سکتا، جب تک وہ اس میدان کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔

دمشق۔۔ قاہرہ یرموک سے ظہر کے بعد ہم اربد واپس ہوئے اور شہر کے رئیس البلدیہ (میئر) نے کھانے پر ہمیں اور شہر کے بہت سے عمائد کو مدعو کیا۔ عصر کے بعد ہم دمشق کے لیے روانہ ہو گئے اور عشا کے وقت دمشق پہنچ گئے۔ شہر کے باہر ہی استاذ محمد المبارک، استاذ مکی الکتانی اور استاذ محمد محمود الصواف (جو آج کل عراق سے نکل کر یہاں پناہ گزین ہیں) اور دوسرے احباب ہمیں لینے کے لیے تشریف لے آئے تھے۔

شام میں ہم نے احباب کے اصرار پر تین روز قیام کیا۔ اس عرصہ میں مختلف احباب، نوجوان طلبہ اور دوسرے حضرات ملنے کے لیے آتے رہے۔ ۱۵ر جنوری کو ہم بذریعہ ہوائی جہاز قاہرہ روانہ ہوئے۔ جس وقت ہمارا جہاز قاہرہ اترا، وہاں ریت کا سخت طوفان آیا ہوا تھا۔ ہوائی اڈہ پر سفارتِ پاکستان کی طرف سے ایک صاحب اور علامہ محمد البشیر الابراہیمی الجزائری مولانا کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

قاہرہ میں قاہرہ سے چونکہ ہمیں طور سینا جانا تھا، جو آج کل ایک فوجی علاقہ ہے اور وہاں جانے کے لیے بہت سے رسمی مراحل طے کرنے ضروری تھے، اس لیے ہمیں اس سفر کے انتظامات کے لیے چند روز قاہرہ ٹھہرنا پڑا۔ پہلے دن تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ قاہرہ میں ہمیں کوئی نہیں جانتا، لیکن شام ہوتے ہوتے یکایک ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ قاہرہ ہمارے دوستوں سے بھرا ہوا ہے۔ جس جس کو ہمارے آنے کی اطلاع ہوتی گئی، ہمارے ہوٹل کا رُخ کرتا گیا۔ چار روز تک آنے والوں کا وہ تانتا بندھا کہ صبح سے لے کر رات کے بارہ بجے تک دم لینے کی فرصت ملنی مشکل ہو گئی۔ آنے والوں میں علماء، پروفیسر، ادیب، ازہر اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی ایک کثیر تعداد تھی، خصوصیت کے ساتھ نوجوان طلباء کا ایک ہجوم عصر کے

وقت سے ہوٹل پہنچ جاتا تھا اور رات کے ۱۱، ۱۲ بجے تک، جب تک انہیں اٹھ جانے کے لیے صاف صاف کہنا نہ پڑتا وہ نہ جاتے تھے۔ ہمارے کالجوں کے طلبہ کی طرح سوالات کی کوئی قسم ایسی نہ تھی، جو انھوں نے چھوڑ دی ہو۔ اسی قیام کے دوران سفیرِ پاکستان خواجہ شہاب الدین صاحب نے پاکستان ہاؤس میں مولانا کے اعزاز میں چائے کی دعوت کی جس میں بہت سے معززین شریک تھے۔ اسی روز رات کو ایک دعوت علامہ بشیر ابراہیمی نے اپنے مکان پر کی، جس میں مصر اور الجزائر اور مراکش کے بہت سے علماء اور معززین شریک تھے، جن میں مشہور مجاہدِ اسلام امیر عبدالکریم الریفی کے چھوٹے بھائی امیر محمد عبدالکریم خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

ہم الجزائر کی حکومت کے دفتر بھی جانا چاہتے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ آج کل ان کے وزراء میں سے کوئی موجود نہیں ہے، اس لیے ہم وہاں نہ جا سکے، مگر اس حکومت کے ذمہ دار افسروں کو جب معلوم ہوا کہ مولانا قاہرہ میں تشریف رکھتے ہیں تو وہ ان سے ملنے کے لیے خود ہوٹل آئے۔ ان سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ الجزائر کی جنگ چھڑنے سے پہلے مولانا کی عربی کتابیں کافی تعداد میں الجزائر پہنچ چکی تھیں اور وہاں بکثرت لوگ ان سے متاثر تھے۔

قاہرہ کا میوزیم | اس قیام کے دوران میں ہم نے اہرام مصر، ابوالہول اور قاہرہ کے میوزیم کو دیکھا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ جب تک آدمی خود ان کو نہ دیکھے وہ انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ درحقیقت ان چیزوں کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ قاہرہ کے میوزیم میں خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کی چیز یہ ان بادشاہوں کی لاشیں ہیں جو تین چار ہزار برس سے آج تک اس طرح چلی آرہی ہیں کہ ان کے چہروں کے نقش اور سروں کے بال اب تک قریب قریب اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہیں۔ ان ہی لاشوں میں ایک اس فرعون کی لاش بھی موجود ہے جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں غرق ہوا تھا۔ اس میوزیم میں ہزاروں برس پہلے کی مصری تہذیب کا پورا نقشہ آدمی کے سامنے آجاتا ہے۔ شاید ہی دنیا میں کسی تہذیب کے آثار اس قدر مرتّب اور منظّم شکل میں محفوظ ہوں۔

دارالعلوم ازہر میں | اسی قیام کے عرصہ میں ہم ازہر بھی گئے اور شیخ اکبر محمد محمود شلتوت اور ڈاکٹر محمد البہی

سے ملاقات کی۔ شیخ پہلے سے مولانا کی کتابیں دیکھے ہوئے تھے، اس لیے وہ غائبانہ ان سے خوب واقف تھے۔ بے حد تپاک اور محبت سے ملے اور اپنے گہرے جذبات کا اظہار فرماتے رہے۔ افسوس ہے کہ آج کل وہ فالج کے مریض ہیں۔ اس مرض کے باوجود ازہر کی مشیخت کے فرائض انجام دے رہے ہیں انہوں نے بڑی محبت سے اپنی کتابیں ہم سب کو عنایت فرمائیں۔

۲۰ جنوری کی شام کو ہم سینا جانے کے لیے قاہرہ سے چل پڑے۔ رات کو سویز میں ٹھہرے اور اگلے روز صبح ۹½ بجے سینا کے لیے روانہ ہوگئے۔ نہر سویز پر ہمیں کئی گھنٹے تک رکنا پڑا، کیونکہ نہر میں سے جہاز گزر رہے تھے۔ ایک بجے ہم نے کشتی کے ذریعے نہر پار کی اور سینا کا اصل سفر شروع کیا۔

وادئ سینا میں سینا آج کل فوجی علاقہ ہے اس لیے اس میں داخل ہونے کے لیے مصلحۃ الحدود (محکمۂ سرحد) سے اجازت لینا ناگزیر تھی، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ محکمہ سرحد کی اجازت اس بات سے مشروط تھی کہ ہم پہلے "مطرانیہ دیر سینٹ کا ترین" سے جس کا دفتر قاہرہ میں ہے، اجازت طلب کریں۔ گویا کہ مصر کی حکومت نے جبل موسیٰ (جبلِ طور) اور اس کے گرد تمام آثار کو عملاً عیسائیوں کے حوالے کر دیا ہے، اور ان سے اجازت لیے بغیر کوئی شخص وہاں نہیں جا سکتا۔ بعد میں جا کر ہمارے اس شبہ کی تصدیق ہوگئی اور دیر میں پہنچ کر ہمیں محسوس ہوا کہ مسلمان حضرت موسیٰ کے آثار سے بالکل دست بردار ہوگئے ہیں اور انہیں عیسائیوں کے حوالے کر دیا ہے

سویز سے ۲۲ کیلو میٹر کے فاصلہ پر عیون موسیٰ کے نام سے ایک جگہ واقع ہے۔ یہ جگہ آج تک عیونِ موسیٰ کے نام سے مشہور چلی آرہی ہے کہ جب حضرت موسیٰ مصر سے نکلے تھے تو یہ ان کی پہلی قیام گاہ تھی۔ یہاں بہت سے چشمے موجود ہیں اس لیے یہاں خوب شادابی و سرسبزی تھی۔ بعض لوگ بارہ چشمے بتاتے ہیں، لیکن اس وقت صرف سات چشموں سے پانی نکلتا ہے۔

عیون موسیٰ سے کچھ آگے ہم نے ایک جگہ دیکھی جہاں الجندی المجہول (UNKNOWN SOLDIER) کی یادگار لگی ہوئی ہے معلوم ہوا کہ ۱۹۵۶ء کی جنگ میں یہودی اس مقام تک پہنچ چکے تھے۔

اس کے بعد ایک مقام آتا ہے جسے حمام فرعون کہا جاتا ہے۔ یہ راستہ سے ذرا ہٹ کر سمندر کے

کنارے واقع ہے۔ پھر وادی غرندل آتی ہے جس کا نام تورات میں ایلیم آیا ہے۔ اس وادی میں بھی چشمے ہیں پھر ابو زنیمہ کا بندرگاہ آتا ہے، جو سویز سے ۱۴۶ کیلو میٹر پر واقع ہے۔ راستہ میں جگہ جگہ ہم کو پٹرول کے چشمے ملے اور ابو زنیمہ کے قریب پٹرول کمپنی کا دفتر ملا۔ ابو زنیمہ کے قریب مینگنیز کی کانیں ہیں اور ایک کارخانہ بھی۔ اس علاقہ میں قدیم زمانہ میں فراعنۂ مصر فیروزہ نکلوایا کرتے تھے اور اب تک فیروزہ وہاں پایا جاتا ہے اور بدوی قریب قریب تین ہزار گنی سالانہ کا فیروزہ یہاں سے حاصل کر لیتے ہیں

ابو زنیمہ سے چند میل آگے تک سارا راستہ سمندر کے کنارے کنارے ہے۔ بائیں طرف کبھی دشت اور کبھی پہاڑ ملتے جاتے ہیں۔ راستہ میں کہیں کہیں بہت اعلیٰ درجہ کی پختہ سڑک ہے اور کہیں کچی سڑک۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں پہلے پختہ سڑک تھی جو بعد میں ٹوٹ گئی۔

نخلستانِ فاران ابو زنیمہ سے تقریباً ۲۰ کیلو میٹر آگے جا کر میناء طور کا راستہ الگ ہو جاتا ہے اور دیر سانت کاترین کے لیے وادیٔ فاران کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں سڑک کا نام و نشان نہیں۔ کبھی حجاز کے راستوں کی طرح ایک ندی کے اندر اندر چلنا پڑتا ہے، جس میں صرف پہلے سے چلی ہوئی موٹروں کے نشانات آدمی کی رہنمائی کرتے ہیں۔ دوراہے سے ۵۲ کیلو میٹر کے بعد ہم نخلستانِ فاران پہنچے، جو بہت ہی سرسبز وادی ہے۔ یہاں کثرت سے پانی ہے اور باغات ہیں۔ یہاں کھجور، انگور، انجیر اور زیتون کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس نخلستان کا طول ۳ میل ہے۔ تورات میں اس کا نام رفیدیم آیا ہے۔ یہاں عیسائیوں کا ایک دیر ہے جس کا تعلق دیر سینٹ کاترین سے ہے۔ جو مسافر دیر سینٹ کاترین جاتے ہیں، ان کا یہاں استقبال کیا جاتا ہے۔ ایک قسیس یہاں مستقل طور پر رہتا ہے۔ ہم تقریباً پونے سات بجے یہاں پہنچے تھے۔ جس قسیس سے ہماری ملاقات ہوئی، وہ یونانی جزیرہ جیوس (CHEOS) کا رہنے والا تھا، لیکن مصر میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے عربی بولتا تھا اور انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس نے قہوہ ہماری تواضع کی۔

دیر سینٹ کاترین فاران کے نخلستان سے دیر سینٹ کاترین ۷۶ کیلو میٹر ہے۔ رات کو پونے نو بجے ہم دیر سینٹ کاترین پہنچے۔ یہ دیر ایک بہت بڑی خانقاہ ہے، جس کا وہ حصہ جہاں بزنگ بُش (وہ جھاڑی

جس میں آگ لگی ہوئی حضرت موسیٰ کو نظر آئی تھی، کی یادگار ہے۔ قسطنطین کے زمانہ کا بنا ہوا ہے یہاں اب بھی کوئی شخص جوتے اتارے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ باقی وسیع خانقاہ جسٹینیان نے بنائی تھی۔ اس کے باہر بہت اُونچی سنگین فصیل بنی ہوئی ہے۔ موجودہ دیر اگرچہ اپنی قدیم بنیادوں پر بنا ہوا ہے، لیکن وقتاً فوقتاً اس میں کافی اصلاحات و ترمیمات ہوتی رہیں۔ دیر کا اپنا پاور ہاؤس ہے، جس سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ کمرے اور برآمدے بہت شاندار بنے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کے ٹھہرنے کے لیے بہت نفیس انتظام ہے۔ سیاحوں کو کھانا پکا کر دینے کے لیے ملازم موجود ہیں۔ باورچی خانہ، کھانے کا کمرہ اور تمام ضروریات فراہم کی گئی ہیں۔ کھانے کا سامان چونکہ یہاں مشکل سے ملتا ہے اس لیے سیاحوں کو اپنے ساتھ کھانے کی چیزیں لانا پڑتی ہیں اور یہاں کے ملازم پکا دیتے ہیں۔ ایک پبلک ریلشنز آفیسر بھی دیر کی طرف سے مقرر ہے، جو سیاحوں کا استقبال کرتا اور آثار کی زیارت میں ان کی ہر طرح کی مدد کرتا ہے۔ رات کے وقت ہم نے پہنچ کر کھانا پکوایا اور کھا کر سو رہے۔

روشن جھاڑی | صبح (۲۲ جنوری) دیر کے پبلک ریلشنز آفیسر نیکو فورس نے ہمیں دیر کا مشاہدہ کرایا۔ اس دیر میں ایک شاندار کنیسہ بنا ہوا ہے، جس میں بیزنطی عہد کی تصویریں آج تک ایسی حالت میں موجود ہیں کہ آدمی کو شبہ ہوتا ہے کہ شاید ابھی حال کی بنی ہوئی ہیں۔ اس طرح سے فرنیچر اور دروازوں کے بعض حصے ایسے ہیں جو جسٹینیان کے عہد سے اب تک قائم ہیں۔ کنیسہ کی پشت پر وہ مقام واقع ہے جہاں حضرت موسیٰ کو جھاڑی میں آگ لگی ہوئی نظر آئی تھی۔ قسطنطین نے یہاں ایک یادگار بنادی تھی اور خاص اس مقام کو جہاں جھاڑی میں آگ لگی معلوم ہوئی تھی، نمایاں کر کے ایک چھوٹے سے مقصورہ کی شکل میں بنا دیا تھا۔ اس مقام کی پشت پر چند فٹ کے فاصلے پر باہر صحن میں وہ درخت ہمیں بتایا گیا جس پر سے اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔ اس درخت کے متعلق پادری نیکو فورس نے ہمیں بتایا کہ صدیوں سے یہ اپنی ابتدائی جڑوں پر بار بار اُگتا رہا ہے، پُرانا ہو کر مر جاتا ہے اور پھر نئے سرے سے انہی جڑوں سے تازہ ہو کر تنا اور شاخیں نکال لیتا ہے۔ یہاں کنیسہ سے متصل سلطان سلیم نے ایک مسجد بنا دی ہے جو اہل دیر ہی کے انتظام میں ہے۔ باوجودیکہ یہ علاقہ ایک مسلمان حکومت کے پاس ہے، لیکن اس مسجد کے لیے کوئی امام و مؤذن وغیرہ کا انتظام نہیں ہے، اور نہ یہاں نماز باجماعت کا کوئی اہتمام کیا گیا ہے، حالانکہ دیر کے ملازمین میں اچھی خاصی تعداد مسلمانوں

کی موجود ہے۔

دیر کے اندر ایک قدیم ڈائننگ ہال ہے، جو راہبوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں ایک میز جسٹینیان کے زمانہ کی اور ایک صلیبوں کے زمانہ کی موجود ہے۔ اس کمرے کے اندر صلیبی عہد کے بادشاہوں نے اپنی تصاویر بنوائی تھیں، جو آج تک اپنے اصلی رنگوں کے ساتھ چلی آرہی ہیں۔

لائبریری اور میوزیم | یہ دَیر گریک آرتھوڈاکس فرقے کے ہاتھ میں ہے۔ اس دَیر کے اندر ایک بہت بڑی لائبریری اور ایک چھوٹا سا میوزیم ہے۔ میوزیم میں جسٹینیان کے عہد سے لے کر آج تک تمام آرک بشپوں کے تاج اور عصا اور ان کی صلیبیں اور پیٹیاں موجود ہیں اور اس کے علاوہ بکثرت تصاویر بیزنطی عہد کی پائی جاتی ہیں، جن کے رنگ اور شان میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا۔ لائبریری میں جدید اور قدیم کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ اور یونانی، عبرانی، سریانی، قبطی، حبشی، فارسی اور روسی زبانوں کی بہت سی قلمی کتابیں ہیں۔ جو کہیں اور موجود نہیں ہیں۔ یہاں تورات کا ایک نسخہ بھی تھا، جو چوتھی صدی عیسوی کا تھا اور جس کا نام CODEXSINAITICUS تھا، مگر ایک روسی پروفیسر اس کو اڑا لے گیا اور زارِ روس کے پاس بیچ دیا۔ زار نے اس کا فوٹو گرافی کا نسخہ یہاں بھیج دیا اور اصل نسخہ اپنے پاس رکھ لیا۔

انسانوں کی کھوپڑیاں | دیر سے متصل ایک چھوٹا سا باغ ہے اور اس کے اندر دیر کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرہ میں جب ہم داخل ہوئے، تو یکایک یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ انسانوں کی بے شمار کھوپڑیاں اور انسانی جسم کی بے شمار ہڈیاں نہایت قرینہ سے سجی رکھی تھیں۔ پادری نیکو فورس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چھٹی صدی عیسوی سے جب کہ یہ دَیر بنا تھا، آج تک اس دیر کے جتنے آرک بشپ اور راہب مرے ہیں، یہ سب ہڈیاں اور کھوپڑیاں ان کی ہیں۔ آرک بشپوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں الگ اور عام راہبوں کی الگ۔ اس حرکت کی وجہ پوچھی تو پادری نیکو فورس نے بتایا کہ ہمارے پاس مُردے دفن کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایک چھوٹی سی جگہ اس نے دکھائی، جس میں چار قبروں کی جگہ تھی۔ پادری نے بتایا کہ جو آرک بشپ اور راہب مرتے ہیں، انہیں یہاں دفن کر دیا جاتا ہے اور سات برس گزرنے کے بعد ان کی قبریں کھول کر ہڈیاں نکال لی جاتی ہیں اور ہڈیوں کو اس لائبریری میں سجا دیا جاتا ہے

جبلِ موسیٰ پر دیر کے مشاہدے سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ ½۹ بجے جبلِ موسیٰ کے لیے تین اونٹوں پر روانہ ہوئے۔ تین چوتھائی چڑھائی اونٹوں پر طے کی گئی۔ اونٹوں کے لیے راستہ ایسا بنایا گیا ہے کہ اگر ذرا بھی اسے چوڑا اور درست کرنے کی طرف توجہ دی جائے، تو موٹر میں اس مقام تک پہنچا جا سکتا ہے، جہاں زائر اونٹوں سے اترتا ہے۔

اس کے بعد پھر پیدل سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے، اور یہ بہت سخت تھکا دینے والی چڑھائی ہے۔ سیڑھیاں بے قاعدہ بنی ہوئی ہیں، بلکہ پتھر رکھ کر راستہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ چیز بھی تھوڑی سی توجہ اور صرفہ سے اس حد تک درست کی جا سکتی ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر جانے والے کو اتنی زیادہ زحمت نہ ہو، جتنی اب ہوتی ہے۔ پیدل چڑھائی کے دوران میں ہمیں جگہ جگہ برف پڑی ہوئی ملی، جس کا دَل بعض مقامات پر تین فٹ تک تھا اور کہیں کہیں پگھلتی ہوئی برف کا پانی پہاڑ میں رس رس کر آ رہا تھا، اور پھر کر سَل کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ سخت تھکا دینے والی چڑھائی پر بار بار بیٹھ بیٹھ کر چڑھتے ہوئے ہم ۱۲ بجے کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے، جہاں ایک چھوٹا سا میدان سا تھا جس میں ایک کنیسہ اور ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ کنیسہ سنگین اور بہت صاف ستھرا بنا ہوا اور خوب سجا ہوا تھا۔ اس کا فرش بھی سنگِ مرمر کا بنا ہوا تھا اور اس کے اندر ایسی صفائی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ پابندی کے ساتھ اس کی جھاڑ پونچھ کی جاتی ہے اور غالباً ہفتہ وار عبادت بھی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر سخت شرم محسوس ہوئی کہ اس کنیسہ سے متصل مسجد کے نام سے جو حجرہ بنا ہوا ہے، وہ انتہائی خستہ حالی میں ہے۔ کوئی فرش اس میں نہیں ہے۔ دروازہ اس کا ٹوٹ گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ برسوں سے کسی نے اس کی دیکھ بھال نہیں کی۔ یہ جمعہ کا روز تھا، ہم نے وہاں قریب کے ایک چشمہ سے پانی لے کر وضو کیا اور ظہر کی نماز ادا کی۔ تقریباً ایک گھنٹہ ٹھہر کر ہم وہاں سے ایک بجے اترنا شروع ہوئے۔ اتار کا راستہ کچھ دُور تک تو وہی تھا، جس سے ہم سیڑھیوں پر چڑھتے تھے، لیکن آگے چل کر ہم دوسرے راستے سے اترے۔ تقریباً پانچ سو فٹ نیچے اترنے کے بعد ہم اس جگہ پہنچے، جہاں حضرت الیاسؑ سامریہ سے بھاگ کر پناہ گزیں ہوتے تھے۔ مقام الیاسؑ تک کا اتار کوئی زیادہ تکلیف دہ نہ تھا، لیکن اس کے بعد دیر تک اتار بے حد تکلیف دہ تھا۔ اگرچہ لفظ سیڑھی کا اطلاق اس پر کیا جاتا ہے

لیکن دراصل وہ سیڑھیاں نہیں تھیں، بلکہ تھوڑا بہت پتھروں کو مرتب کر دیا گیا ہے۔ سخت تھکا دینے والے آثار سے گزرتے ہوئے ہم لوگ ۲ بجے کے قریب دیر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ان سیڑھیوں کی تعداد ۳۴۰۰ ہے۔

سامری کا گوسالہ ۲۳ر جنوری کی صبح ہم قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں دیر سے ۱½ کیلومیٹر (ایک میل)، پر ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے کے اوپر سیدنا ہارون علیہ السلام کا مقام آیا۔ یہ پہاڑی اس وادی میں واقع ہے جس میں سامری نے گوسالہ بنا کر پیش کیا تھا اور بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ اور یہ مقام سیدنا ہارونؑ غالباً اسی جگہ بنا ہوا ہے، جہاں حضرت موسیٰ نے طور سے واپس آکر حضرت ہارونؑ سے مواخذہ کیا تھا۔

اس کے بعد یعنی دیر سے تقریباً دس کیلومیٹر پر ایک وادی میں حضرت صالح علیہ السلام کا مقبرہ ہے۔ ہر سال یہاں دیہاتیوں کا بہت بڑا مجمع ہوتا ہے، جس میں وہ قربانیاں کرتے ہیں اور سارا میدان بھر جاتا ہے۔ اسی طرح کا مجمع حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر پر بھی ہوتا ہے۔ مقامی روایات یہ ہیں کہ قوم ثمود پر جب عذاب نازل ہوا تو حضرت صالح ہجرت کر کے یہاں آگئے تھے۔

دوبارہ قاہرہ میں شام کو ۶½ بجے قاہرہ واپس پہنچے۔ ۲۴ر جنوری سے پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ۵ر کی شام تک جاری رہا۔ جن حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں سے شیخ ابوزہرہ استاذ مصطفیٰ زرقاء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۲۴ر کی دوپہر کے وقت شیخ ازہر کا مولانا کے نام پیغام آیا کہ مجھ سے ملے بغیر قاہرہ سے نہ جائیں، چنانچہ رات کو ہم ان سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر گئے۔ بڑی ہی محبت اور اخلاص سے بار بار مولانا کو دعائیں دیتے اور ان کی اسلام کی راہ میں خدمات کو سراہتے رہے۔ بار بار مولانا کے ساتھ اپنے بیٹھنے پر خوشی اور فخر کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی گفتگو اس قدر جذبات سے لبریز تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے آج اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ فرماتے تھے کہ اگر مولانا کو تکلیف نہ ہوتی، تو میرا دل ساری رات ان کے ساتھ بیٹھے رہنے اور باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ دوسرے تمام مسلمانوں کو تو ان کے شاگردوں نے چائے ڈال کر پلائی، لیکن مولانا کی پیالی میں شیخ نے اپنی بیماری کے باوجود خود

چلائے ڈالی۔

قاہرہ سے واپسی پر شیخ ابوزہرہ، مصطفیٰ زرقا، محمد قطب، محمود محمد شاکر اور بہت سے دوسرے اہل علم حضرات نے اپنی تصنیفات کا ایک ایک سیٹ مولانا کو بطور ہدیہ پیش کیا۔ اب گویا مولانا پاکستان آ رہے ہیں تو اپنے ساتھ کتابوں کی ایک پوری لائبریری لا رہے ہیں۔ شیخ حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے سیف الاسلام نے بھی اپنے دادا کی تمام تصنیفات ہدیۃً دی ہیں۔

پھر دمشق میں ۲۵ جنوری کی رات ½ ۱۰ بجے ہم لوگ قاہرہ سے بذریعہ ہوائی جہاز دمشق واپس آئے۔ دو دن وہاں قیام کیا جس میں ملاقاتوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ آج ۲۸ کو ہم لوگ کویت پہنچ رہے ہیں یہ خط میں دمشق اور کویت کے درمیان ہوائی جہاز میں مکمل کر رہا ہوں، اور ان شاء اللہ کویت میں اترتے ہی اسے حوالۂ ڈاک کر دوں گا۔

کویت میں ہمارا ارادہ تین چار دن ٹھہرنے کا ہے۔ اس کے بعد مولانا اور چودھری غلام محمد صاحب غالباً ۲ یا ۳ فروری کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچ جائیں گے۔ مولانا کراچی میں بہت کم رکنا چاہتے ہیں، اس لیے خیال ہے کہ وہ ۸ تک لاہور پہنچ جائیں گے۔ میں سامان کی وجہ سے ہوائی جہاز کے بجائے بحری جہاز سے سفر کروں گا اور غالباً ۷، ۸ فروری تک کراچی اور ۹ یا ۱۰ تک لاہور پہنچ جاؤں گا۔ الحمد للہ مولانا کی صحت بالکل ٹھیک ہے اور ہم دونوں یعنی میں اور چودھری صاحب بھی بخیریت ہیں۔ تمام احباب اور جاننے والے حضرات سلام قبول فرمائیں اور دعاؤں میں فراموش نہ کریں۔

مولانا مودودی صاحب سے بی۔بی۔سی لندن کے نمائندہ موسیٰ الدجانی کا انٹرویو

مؤرخہ ۱۲/۱/۶۰

۱۔ سوال: آپ کی اردن میں تشریف آوری کا مقصد کیا ہے۔

جواب: اس سیاحت سے میرا مقصد انبیاء علیہم السلام کے آثار اور ان اقوام کے آثار کو بچشم خود

دیکھنا ہے۔ جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ مَیں آج کل قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھ رہا ہوں۔ اس تفسیر کی تیاری کے دوران میں مَیں نے محسوس کیا کہ قرآن مجید کے بہت سے مقامات کو آدمی اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک ان علاقوں اور مقامات کو دیکھ نہ لے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اسی وجہ سے مَیں نے یہ سفر کیا ہے اور اس سلسلہ میں مکّہ، طائف، بدر، مدینہ، مدائنِ صالح، خیبر، تبوک اور مغائرِ شعیب کو دیکھتا ہوا آرہا ہوں۔ اور اب اردن و فلسطین کے آثار دیکھنے کے بعد جزیرہ نما سینا جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

۲۔ سوال: ہم پاکستان کی جماعتِ اسلامی کے متعلق اکثر سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ کیا اس کے متعلق آپ ہمیں کچھ معلومات دے سکتے ہیں؟

جواب: جماعت اسلامی موجودہ انقلاب کے زمانہ میں پاکستان میں موجود نہیں ہے۔ یہ جماعت اب سے ۱۹ سال پہلے اس مقصد کے لیے قائم ہوئی تھی کہ اسلام کو ایک مکمّل نظامِ حیات کی حیثیت سے عملاً قائم کیا جائے اور وہ اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ صرف کتابوں کے اوراق پر ہی نہیں بلکہ عملی زندگی کے میدان میں کارفرما ہو۔ اب اسی مقصد کے لیے میں اپنی ذاتی حیثیت سے کام کر رہا ہوں اور امید ہے کہ دوسرے لوگ بھی اسی طرح فرداً فرداً کام کر رہے ہوں گے۔

۳۔ سوال: عربی زبان میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ کیا آپ ان کے متعلق ہمیں کچھ بتا سکتے ہیں؟

جواب: عربی زبان میں اب تک میری ۲۰ سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں الحجاب، الربا، مبادی الاسلام اور اسس الاقتصاد بین الاسلام والنظم المعاصرة حال ہی میں شائع ہوئی ہیں اور آج کل سورۃ نور تحت الطبع ہے

۴۔ سوال: عرب اور دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے مسائل میں آپ لوگ کس حد تک دلچسپی رکھتے ہیں، خصوصاً مسئلۂ فلسطین کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے:

جواب: قضایا العرب اور قضایا المسلمین میرے نزدیک الگ الگ نہیں ہیں۔ ہم ان سب کو

تمام عالم اسلامی کے مشترک قضایا سمجھتے ہیں خواہ وہ بلاد عرب کے قضایا ہوں یا پاکستان کے یا انڈونیشیا کے یا اور کسی ملک کے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق فلسطین کا قضیہ بھی صرف عربوں کا قضیہ نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کا قضیہ ہے۔ اسے محض عربوں کا قضیہ قرار دینا اسے کمزور کرنا ہے۔

۵۔ سوال: آپ کے ہاں پاکستان میں عربی زبان کس رفتار سے پھیل رہی ہے؟

جواب: عربی زبان قرآن اور سنت کی زبان ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں مسلمان اس کی تعلیم پر ہمیشہ بہت زور دیتے رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں ہزاروں مدارس ایسے موجود ہیں جن میں عربی زبان، تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں یونیورسٹیوں اور ہائی سکولوں میں عربی زبان کی تعلیم کا انتظام روز بروز زیادہ وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔

تخلیقِ کائنات — ایک حادثہ یا ایک منصوبہ؟

"فرینک ایلن"
(ایم اے، پی ایچ ڈی۔ پروفیسر بایو فزکس، مینی ٹوبا یونیورسٹی، کینیڈا)

[یہ مضمون ایک قابلِ قدر کتاب "پھیلتی ہوئی کائنات میں وجودِ باری تعالیٰ کی شہادت" (THE EVIDENCE OF GOD IN AN EXPANDING UNIVERSE) کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب حال میں امریکہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں دنیا کے چالیس بڑے بڑے سائنس دانوں کے قلم سے ہستی باری تعالیٰ کے متعلق سائنس کی شہادتوں پر مضامین درج کیے گئے ہیں۔ انہوں نے ناقابلِ تردید شواہد سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ یہ کائنات ایک مدبّر کی تدبیر کا نتیجہ ہے اس کی تخلیق میں ایک خالق کا ہاتھ ہے جو لوگ قدرت کی کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود اس ذات بے ہمتا کو نہیں مانتے وہ ضدی اور ہٹ دھرم ہیں اور محض اوہام کی بنا پر اس بڑی حقیقت کی نفی کر رہے ہیں۔

ع۔ ح۔ ص]

بارہا اس بات کو ثابت کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں کہ یہ عالمِ مادی اپنے وجود کے لیے کسی خالق کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اس عالم کا وجود بہر حال ایک امرِ واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لیے لامحالہ اس کے موجود ہونے کی کوئی نہ کوئی توجیہ کرنی پڑتی ہے عام طور پر اس کی چار توجیہات پیش کی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ اس دنیا کا وجود محض ایک فریبِ نظر اور ایک واہمہ ہے، اس کی اصل حقیقت کچھ بھی نہیں۔

دوسری یہ کہ یہ کائنات از خود عدم سے وجود میں آ گئی ہے۔

تیسری یہ کہ یہ ازلی و ابدی (باصطلاحِ فلسفہ "قدیم") ہے اور اس کا کوئی آغاز اور اختتام نہیں ہے۔

چہارم یہ کہ یہ ایک خالق کی تخلیق کا شاہکار ہے۔

پہلی توجیہ اگر تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں انسانی شعور کی مابعد الطبیعی تعبیر کے سوا کوئی حل طلب مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا اور اسے خود ایک واہمہ قرار دیا جا چکا ہے۔ علم طبیعیات کے ماہر سر جیمز جینز نے اپنی کتاب "پراسرار کائنات" میں ان غیر حقیقی مفروضات پر ان الفاظ میں بحث کی ہے:

"علم طبیعیات کے جدید تصورات کے مطابق کائنات کی کوئی مادی توجیہ ممکن نہیں اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ کائنات کا سارا معاملہ ہی اب ایک تخیلاتی معاملہ بن گیا ہے"

اس نقطۂ نظر کے مطابق گویا صورتِ حال یہ ہے کہ خیالی گاڑیاں، جو بظاہر فرضی مسافروں سے لدی ہوئی ہیں، غیر حقیقی دریاؤں کو تصورات کے ساختہ و پرداختہ پلوں کے ذریعہ عبور کر رہی ہیں۔

دوسرا تصور کہ یہ مادہ و توانائی کی دنیا از خود پردۂ عدم سے وجود میں آ گئی، یہ بھی اسی طرح ایک ایسا لغو مفروضہ ہے کہ اسے کسی طرح قابلِ غور نہیں قرار دیا جا سکتا۔

تیسرا خیال کہ یہ کائنات ازلی و ابدی ہے، نظریۂ تخلیق سے کم از کم اس پہلو سے میل کھاتا ہے کہ یا تو یہ جامد مادّہ اپنے اندر مستور توانائی کے ساتھ ازلی و ابدی وجود رکھتا ہے اور یا پھر اس کے خالق کی ذات ازلی و ابدی ہے۔ اس پہلو سے ان دونوں تصورات کے دلائل بھی تقریباً یکساں ہیں۔ لیکن حرکیات حرارت (THERMO DYNAMICS) کے قوانین سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کائنات بتدریج انحطاط پذیر ہے اور ایک وقت آنے والا ہے جب تمام موجودات اپنی حرارت کھو بیٹھیں گی۔ توانائی دقوت فنا ہو جائے گی اور زندگی ناممکن ہو جائے گی۔ یہ دہکتا ہوا سورج، ستارے اور زندگی کے ہمہموں سے بھرپور یہ زمین اس حقیقت کی ایک جامع شہادت ہیں کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی نقطۂ آغاز ضرور ہے اور ایک معین و مقرر ساعت میں یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ اور یہی حقیقت اس امر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آ گئی بلکہ یہ کسی کی قوتِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ علتِ اولیٰ کی حیثیت سے ایک ازلی و ابدی اور ایک علیم و قدیر ہستی کا وجود لازماً ہونا چاہیے

جس نے اس کائنات کو پیراہنِ وجود بخشا اور اس کی صورت گری کی۔

زندگی کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے اس کرۂ ارضی پر اتنے بے شمار انتظامات نظر آتے ہیں کہ یہ کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہیں۔

اوّلاً، یہ کرۂ زمین ایک گولہ کی شکل میں خلاء میں معلق ہے[1] اور اپنے قطبی محور پر اس طرح گردش کر رہا ہے کہ اس سے دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن آتا ہے، پھر یہ کرہ سورج کے گرد بھی گھوم رہا ہے اور سال کی معیّن مدت کے اندر اپنا ایک چکر پورا کرتا ہے۔ یہ حرکات خلاء میں اس کو صحیح سمت میں قائم رکھتی ہیں۔ قطبی محور پر اپنے مدار کی جانب اس کا ۲۳ درجہ جھکاؤ موسموں میں باقاعدگی پیدا کرتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں زمین کا زیادہ سے زیادہ رقبہ آبادکاری کے قابل ہو جاتا ہے اور مختلف انواع و اقسام کی رنگارنگ روئیدگی زمین کی رونق و افادیت کو دوبالا کر دیتی ہے۔ اگر یہ کرۂ زمین گردش کرنے کے بجائے ساکن و جامد ہوتا تو نباتات اور پیداوار میں اتنی متنوع اور گوناگوں اقسام ممکن نہ ہوتیں۔

دوم، ایسی گیسیں جو بقائے حیات کے لیے ضروری ہیں فضا میں تقریباً پانچ سو میل کی بلندی تک محیط ہیں اور ان کا نہایت دبیز پردہ کرۂ زمین کو ان شہابوں کی تباہ کن بارش سے محفوظ رکھتا ہے جو روزانہ تقریباً دو کروڑ کی تعداد میں تیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کرۂ ارضی کی فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ دوسرے اثرات کے علاوہ اسی ہوا کا پردہ درجۂ حرارت کو ان حدودِ اعتدال کے اندر رکھتا ہے جو زندگی کی بقاء کے لیے ناگزیر ہیں۔ ہوائیں بادلوں کی صورت میں سمندروں کے تازہ پانی کی بھاپ کو اڑا کر خشکی کی طرف لے جاتی ہیں اور دُور دور تک خشک اور پیاسی زمینوں کو سیراب کرتی ہیں ورنہ یہ زمین بے آب و گیاہ صحرا میں تبدیل ہو جائے، گویا دوسرے لفظوں میں فطرت نے سمندروں اور ہواؤں کی ہم آہنگی کو اس کرۂ ارضی میں بقائے زیست کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

پانی میں چار اہم خصوصیات رکھدی گئی ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ کہ وہ کم سے کم درجۂ حرارت میں آکسیجن

---

[1] جیسا کہ انجیل میں آتا ہے "اس نے زمین کو بغیر کسی سہارے کے معلق کر رکھا ہے۔"

کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو جذب کرتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ کہ نقطۂ انجماد سے چار درجہ سنٹی گریڈ اوپر اس کی کثافت (DENSITY) انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے جس کی وجہ سے دریا اور جھیلیں عموماً منجمد نہیں ہوتیں تیسری خصوصیت یہ کہ برف کی کثافت پانی سے کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے برف پانی کی سطح کے اوپر ہی اوپر رہتی ہے۔ اور چوتھی خصوصیت یہ کہ جب پانی جمنے لگتا ہے تو وہ کثیر مقدار میں حرارت خارج کرتا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے جاڑوں کے طویل موسم میں جھیلوں، دریاؤں اور سمندروں کے اندر بے شمار حیوانات زندہ رہتے ہیں۔ ورنہ اگر ان کا سارا پانی جم جاتا تو ان میں کوئی زندگی ممکن نہ ہوتی۔

خشک زمین ارضی حیات کے لیے ایک مستحکم بنیاد کا کام دیتی ہے۔ مٹی ایسے نمکیات مہیا کرتی ہے جنھیں جذب کر کے مختلف قسم کی نباتات اور پودے دھرتی کا سینہ چیر کر باہر نکلتے ہیں اور جاندار مخلوق کے رزق کا وسیلہ بنتے ہیں۔ اسی طرح زمین کی سطح کے بالکل قریب مختلف قسم کی دھاتوں کا وجود تہذیب کے نشو ونما اور ارتقاء میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے[1]۔

بعض لوگ فضائے بسیط کی بے اندازہ پہنائیوں میں اس ذرا سے کرۂ زمین کا کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں جیسے یہ بڑی انمل بے جوڑ سی بات ہو۔ لیکن انہیں اس کا اندازہ نہیں کہ اگر اس کا حجم کم و بیش ہوتا تو اس میں زندگی محال ہو جاتی۔ اگر یہ کرۂ زمین چاند جتنا چھوٹا ہوتا، یعنی اس کا قطر اصل کی نسبت $\frac{1}{4}$ ہوتا تو اس کی کششِ ثقل زمین کی موجودہ کششِ ثقل کا $\frac{1}{6}$ رہ جاتی، اس میں پانی اور ہوا کا وجود ممکن نہ رہتا، اس میں درجۂ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک جا پہنچتا اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا۔ اس کے برعکس اگر کرۂ زمین کا قطر اب کی نسبت دوگنا ہوتا تو اس کی سطح موجودہ سطح کے مقابلہ میں چار گنا وسیع ہو جاتی، کششِ ثقل دوگنی بڑھ جاتی، ہوا کے غلاف کا حجم خطرناک حد تک گھٹ جاتا

---

[1] یہی وہ حقیقت ہے جس کو یسعیاہ نبی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "خداوند خدا نے دنیا کو بے مقصد اور بے مصرف نہیں بنایا بلکہ اس لیے تخلیق کیا ہے کہ اس میں زندگی کی رونق اور ہمہمے قائم ہوں"۔

اور اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہو جاتا جس کا ردعمل زندگی پر نہایت مہلک ہوتا ہمیشہ سرد رہنے والے خطوں میں نمایاں اضافہ ہو جاتا اور بہت تھوڑے ایسے علاقے باقی رہ جاتے جہاں زندگی اور آبادی ممکن ہو سکتی۔ ایک علاقے کے رہنے والے دوسرے علاقے کے لوگوں سے بالکل کٹ جاتے ذرائع رسل و رسائل اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں آمد و رفت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتی۔

اگر ہماری زمین سورج جتنی بڑی ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کششِ ثقل ڈیڑھ سو گنی بڑھ جاتی، ہوا کے غلاف کی دبازت گھٹ کر پانچ سو میل کی بجائے صرف چار میل رہ جاتی۔ پانی کا بھاپ میں تبدیل ہونا ممکن نہ رہتا اور ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا۔ ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن بڑھ کر ۱۵۰ پونڈ ہو جاتا، انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر رہ جاتا، اور اس مخلوق میں کسی قسم کی ذہنی زندگی اور اس کی نشوونما ناممکن ہو جاتی۔

بخلاف اس کے اگر زمین کا سورج سے موجودہ فاصلہ بڑھا کر دوگنا کر دیا جاتا تو سورج سے حاصل ہونے والی حرارت کی مقدار گھٹ کر صرف ایک چوتھائی رہ جاتی، اس کی گردش کی رفتار نصف رہ جاتی، موسمِ سرما کا دوران طویل ہو کر دوگنا ہو جاتا اور زندگی منجمد ہو کر رہ جاتی۔

اگر سورج اور زمین کا درمیانی فاصلہ گھٹا کر نصف کر دیا جاتا تو سورج سے حاصل ہونے والی حرارت چارگنی بڑھ جاتی، زمین کی رفتارِ گردش دوگنی تیز ہو جاتی، موسموں میں اوّل تو تغیّر کا امکان نہ رہتا اور اگر سردی کا موسم آتا بھی تو اس کی مدّت نصف رہ جاتی اور کرۂ زمین پر تپش اس درجہ بڑھ جاتی کہ اس میں زندگی کا برقرار رہنا ممکن نہ ہوتا۔

یہ صرف کرۂ زمین کی موجودہ جسامت، اس کے سورج سے موجودہ فاصلہ اور اس کی منفرد رفتار گردش ہی کے برقرار رہنے کا نتیجہ ہے کہ اس زمین پر جینا ممکن ہے اور بنی نوع انسان طبعی، ذہنی اور روحانی زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس عالمِ وجود کے پیچھے کوئی اسکیم اور کوئی کارفرما قوت موجود نہیں تو

لامحالہ یہ قرار دینا پڑیگا کہ یہ عالمِ رنگ و بُو محض ایک اتفاقی حادثہ کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہو گیا۔ اب دیکھیے، بخت و اتفاق محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی اور یقینی معلومات ممکن نہیں ہوتیں۔ اس نظریہ کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم حق و ناحق میں بآسانی امتیاز کر سکتے ہیں اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے امکاناتِ صدور کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے۔

پروٹین جو تمام ذی حیات خلیوں (CELLS) کے لیے اجزائے لازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پانچ عناصر پر مشتمل ہیں۔ کاربن۔ ہائیڈروجن۔ آکسیجن اور گندھک۔ ہر پروٹینی سالمہ (MOLECULE) ان عناصر کے ۴۰ ہزار دقیق ذرات یا جواہر (ATOMS) پر مشتمل ہوتا ہے۔ پھر کائنات میں ۹۲ کیمیاوی عناصر بالکل منتشر اور غیر مرتب حالت میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اب اس امر کا امکان کہ ان ۹۲ عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آسکے کہاں تک ہے؟ مادہ کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جاسکتی ہے۔ ایک سوئس حساب دان چارلس ایوجین گائی نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان ۱۶۰، ۱۰ کے مقابلہ میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ۱۶۰ ، ۱۰ کا مطلب یہ ہے کہ دس کو ۱۶۰ مرتبہ پے درپے ضرب دی جائے۔ گویا یہ ایک ایسا بعید از امکان قیاس ہے کہ اعداد کی زبان میں اس کا اظہار بھی مشکل ہے۔ صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے اس پوری کائنات کے موجود مادہ سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا ارب ہا ارب (10^{243}) سالوں میں کہیں کوئی امکان ہو گا۔

پروٹین امینو ایسڈس کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ

بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر جے۔ بی لیڈز (انگلستان) نے حساب لگایا ہے کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو لاکھوں (۱۰،۴۸) طریقے سے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کسی طرح عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لیے اتنے بہت سے بعید از امکان اتفاقات بیک وقت صادر ہو جائیں۔

پھر پروٹین خود ایک کیمیاوی شے ہے جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی۔ ان میں زندگی کی حرارت تو جبھی پیدا ہوتی ہے جب ان کے اندر روح پھونکی جائے۔ صرف ایک عقل کل، ایک بے حد و نہایت ذہن یعنی خدا ہی یہ سوچ سکتا تھا کہ زندگی کی آماجگاہ بننے کے لیے اس طرح کا ایک سالمہ موزوں ہو سکتا ہے، وہی اس سالمہ کی تحقیق کر سکتا تھا اور وہی اسے زندگی بخش سکتا تھا۔

مطبوعات

سرسید کے مذہبی افکار (انگریزی)	تالیف جناب بشیر احمد ڈار صاحب ایم۔ اے۔ ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۲۹۶

قیمت دس روپے۔ طباعت عمدہ۔

سرسید کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کسی زمانے میں بہت کچھ لکھا گیا تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد لوگوں کی دلچسپی اس موضوع سے ہٹ گئی۔ دوسرے نئے موضوعات پیدا ہوتے رہے اور لوگوں کی توجہ اس طرف لگی رہی۔ اب کچھ عرصہ سے بعض حضرات نے سرسید کے معتقدات کی طرف پھر توجہ فرمائی ہے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان حضرات کو سرسید کی ذات یا ان کے مذہبی خیالات سے کچھ دلچسپی پیدا ہوگئی ہے یا سرسید کی ذات کو وہ لوگوں کے نسیان اور فراموش کاری سے بچانا چاہتے ہیں بلکہ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرسید کے اعتقادات آج کل ان حضرات کے لیے بڑی حد تک مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں۔ جو اسلام میں مغربی افکار داخل کر کے ایک نئی فکری وحدت کو بنانے کے آرزومند ہیں۔ اس وجہ سے چند حضرات بڑے جوش و خروش سے سرسید کی زندگی اور ان کے عقائد، معاشرتی تصورات اور کلامی خیالات کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مناسب وقت ہے کہ سرسید کے خیالات کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے اور ان حالات کو پیش نظر رکھ کر جن سے مجبور ہو کر انہوں نے بعض اوقات افراط و تفریط سے کام لیا ان فیصلوں پر روشنی ڈالی جائے جو انہوں نے ملت کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے کیے تھے۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ سرسید مرحوم کے زمانہ کے حالات اس وقت موجود نہیں اور مغرب سے بیجا مرعوبیت کے لیے اب کوئی معذرت بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ خصوصاً مذہبی اور اخلاقی مسائل میں تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔

غالباً اسی ضرورت کو ملحوظ خاطر رکھ کر جناب بشیر احمد صاحب ڈار نے یہ کتاب تصنیف فرمائی

ہے کہ سرسید کے مذہبی افکار اور اجتہادات کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے اور جو باتیں قابلِ قبول ہیں ان کو قبول کیا جائے اور جہاں ان سے اضطراراً یا اپنے وقت کے ماحول کے اثر سے کوئی کوتاہی ہو گئی ہے اُس پر غور کیا جائے۔ مثلاً انکار معجزات، حضرت عیسیٰ کی پیدائش۔ حضرت موسیٰ کا سمندر کو اس طرح عبور کرنا کہ پانی دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ عصا کا اژدہا بن جانا وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام معجزات کی سرسید نے عقلی تاویل پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو طفلانہ اور مضحکہ خیز سی معلوم ہوتی ہے اور یہ تمام پاپڑ اس لیے بیلے ہیں کہ اسلام میں کوئی چیز خلافِ عقلِ مغربی داخل نہ ہو سکے۔ تاکہ مغربی لوگوں کی نظروں میں سبکی نہ ہو۔ عقل کو پرکھنے کا معیار بھی سرسید نے مغرب سے ہی حاصل کیا تھا۔ اس لیے ان کو مذہب میں تمام مافوق الفطرت اور ماورائی چیزیں دیکھ کر وحشت سی ہوتی تھی۔ غرضکہ سرسید نے اپنی زندگی کا یہ مقصد بنا لیا تھا کہ ہر طرح وہ اسلام کو عین فطرت کے مطابق پیش کریں گے۔ اسی وجہ سے مقامِ رسالت کے تعین کے بارے میں اُن سے بھاری لغزش ہوئی۔ وہ حضرت جبرئیل کی پیغام رسانی کے منکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ رسول میں خدا کی مرضی معلوم کرنے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ اور ان کا دل ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں انوارِ الٰہی تجلّی ریز ہوتے ہیں۔ کوئی فرشتہ خدا اور رسول کے درمیان پیغام رسانی کا کام نہیں دیتا۔ سرسید پر لوگ ان کی زندگی میں ان باتوں پر اعتراض کرتے، مثلاً ایک خط میں جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا۔ ایک شخص سوال کرتا ہے "کیا آپ کے نزدیک خدا کی جگہ نیچر کو قائم کرنا۔ ملائکہ اور شیاطین کے وجود سے انکار کرنا۔ دوزخ اور جنت کے وجود کو تسلیم نہ کرنا۔ آدمؑ اور حوّا کے قصہ کو افسانہ سمجھنا معجزات کی ہنسی اڑانا کفر نہیں ہے"

بشیر احمد ڈار صاحب نے بعض مقامات پر سرسید کے معتقدات کے لیے معذرت پیش کرنے کا رنگ اختیار کیا ہے اور بعض جگہ ان کو سراہنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن بالکل واضح قسم کی کمزوریوں کی نشاندہی بھی کر جاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں "سرسید اس جگہ دلائل میں منطقی ربط کی بھی پروا نہیں کرتے جہاں کہ وہ کسی مسئلے میں اپنے پسندیدہ نتائج برآمد کرنے کا ارادہ کر لیں[1]"

---

[1] صفحہ ۱۵۲

اس سلسلے میں بشیر صاحب نے سرسید کا ایک قول نقل کیا ہے جو رسالہ تہذیب الاخلاق سے لیا گیا ہے اور جس میں سرسید یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ شخص بھی مسلمان کہلانے کا مستحق ہے جو صرف خدائے واحد میں اعتقاد رکھتا ہو۔ "اسلام ایک اتنا سادہ مذہب ہے کہ لا مذہبیت بھی اس میں شامل ہے۔ ہر مذہب میں کچھ ایسے رسومات اور اعتقادات ہوتے ہیں جن سے وہ دوسرے مذاہب سے مختلف اور ممتاز ہوتا ہے لیکن اصلی مذہب ان رسومات اور اعتقادات سے پاک ہوتا ہے اور ایسا ہی مذہب اسلام ہے جسے ہم نیچر یا فطرت بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ شخص جو کسی رسول یا اوتار یا الہامی کتاب میں یا اعتقادی سعادت میں یقین نہ رکھتا ہو بلکہ صرف خدائے واحد پر ایمان لائے صحیح معنوں میں مسلمان ہے۔"[1]

سرسید کی اسی قسم کی عبارات کی وجہ سے ڈار صاحب کو اپنی کتاب میں یہ بھی لکھنا پڑا۔ "ایک جگہ تو وہ خالص مذہبی رنگ میں گفتگو کرتے ہیں لیکن دوسرے مقام پر اس طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے خدائے واحد کے تو قائل ہیں لیکن الہامی مذہب کے قائل نہیں اور کہیں ان دونوں اعتقادات کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"[2] بشیر صاحب کے قول کے مطابق یہ غلط مبحث اس لیے پیدا ہوا ہے کہ سرسید کا خدا کا تصور کچھ تو ان کے مذہبی عقائد کی بنا پر قائم ہوا ہے اور کچھ نیچر کے متعلق مغربی تصورات کا مرہونِ منت ہے۔ اب یہ بات ذرا غور طلب ہے کہ رسول اور الہامی کتاب پر ایمان نہ لا کر اسلام کس حد تک باقی رہ سکتا ہے حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے ساتھ وابستہ کیا ہے مثلاً اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول۔

اسی طرح جہاد کے معاملہ میں بھی سرسید نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کے نزدیک جہاد صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ ایک تو اس صورت میں جبکہ کفار اسلام کو مٹانے کے لیے مسلمانوں پر حملہ کر دیں اور دوسرے اس وقت جبکہ مسلمان کسی کافر کی حکومت میں رہتے ہوں اور ان کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی اجازت نہ ہو یا اس میں حکومت کی طرف سے رکاوٹ ڈالی جاتی ہو۔ اس میں بھی

[1] صفحہ ۱۵۲ [2] صفحہ ۱۷۷

پھر ایک شرط یہ لگادی ہے کہ اگر وہ مسلمان اس کافر حکومت کی رعایا ہوں یا صلح سے رہنے کا معاہدہ کرلیا ہو تو بھی ان کو بغاوت کرنے کا حق نہیں ہے ایسی حالت میں صرف وہ یہ کرسکتے ہیں کہ اس حکومت کی حدود سے ہجرت کرجائیں۔ البتہ وہ لوگ جو اس حکومت کی رعایا نہ ہوں اپنے دینی بھائیوں کو آزاد کرانے کے لیے جہاد کرسکتے ہیں۔ پہلی شق میں یہ شرط کہ اگر کفار صرف اسلام دشمنی سے حملہ کریں تو جہاد جائز ہے لیکن اگر صرف توسیع حکومت کے لیے حملہ کریں تو جہاد جائز نہیں کس قدر مضحکہ خیز سی معلوم ہوتی ہے۔ غلام بن جانے کے بعد کسی قوم کی کون سی چیز محفوظ رہ سکتی ہے۔ ذہنی غلامی مسلط ہو جاتی ہے جو غلامی کی سب سے زیادہ خطرناک صورت ہے۔ فاتح کے مذہب اور تہذیب کو آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر بالادستی حاصل ہو جاتی ہے "الناس علیٰ دین ملوکھم" ایک ابدی صداقت ہے اور دنیا کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے مفتوح ہمیشہ اپنے فاتح کے دین کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اس میلان کے مستقل وجوہ و اسباب ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

اس برصغیر میں احادیث کے خلاف جو شک کی ایک عام فضا تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں بھی سرسید کا حصہ کسی دوسرے سے کم نہیں ہے۔ احادیث پر اُن کا اعتراض بھی وہی ہے جو کہ منکرین حدیث کی طرف سے عام طور پر پیش کیا جاتا ہے یعنی جعلی احادیث اس قدر زیادہ ہیں کہ ان میں سے صحیح کا علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ قرآن مجید ہی تمام مسائل کے حل کرنے کے لیے کافی ہے۔ مگر لطف کی بات دیکھیے کہ جس معاملے میں کوئی کمزور سے کمزور بلکہ وضعی حدیث بھی اُن کے دل پسند نظریہ کی تائید کرتے ہوئے نظر آتی ہے وہ فوراً اُسے قبول کر لیتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ کی طرف معراج جسمانی کے انکار کو منسوب کرنا یا تو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اُن کا دینی مطالعہ بالکل سطحی تھا یا پھر اپنا مطلب نکالنے کے لیے وہ علمی دیانت کا بھی پاس نہ رکھتے تھے۔

کتاب کے آخری دو صفحات میں جناب ڈار صاحب نے سرسید کے اجتہادات اور خصوصاً احادیث کے بارے میں اُن کے نقطۂ نظر کو سراہنے کی کوشش کی ہے۔ اس معاملہ میں انہوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ انداز بیان اس قسم کا اختیار کیا گیا ہے کہ طرفداری کا پہلو نمایاں نہ ہو لیکن

اگر پوری عبارت کو دیکھا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ان معاملات میں سرسید کے لیے معذرت ہی پیش نہیں کرتے بلکہ پر زور حمایت بھی کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ وہ احادیث جو جرح و تعدیل کے معیار پر پوری نہ اتریں انہیں بلاشبہ رد کر دینا چاہیے۔ اور ائمہ احادیث اس خدمت کو بخوبی سرانجام دے چکے ہیں اور آج بھی ان احادیث پر نقد کی گنجائش موجود ہے لیکن وہ احادیث جو بالکل صحیح ہیں انہیں کسی مصلحت کی بنا پر یا دین کے اندر کوئی رخصت ڈھونڈنے کے لیے نظرانداز کرنا دین کی خدمت نہیں بلکہ دین کی تضحیک و تذلیل ہے۔

جناب ڈار صاحب انگریزی کے ایک نہایت اچھے انشا پرداز اور مرتب ہیں اور اس کتاب کو جس خوبی کے ساتھ انہوں نے ترتیب دیا ہے وہ اُن کی قابلیت کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔ ایک شخص صرف اس ایک کتاب کے مطالعہ سے سرسید کے سارے افکار و نظریات سے آشنا ہو سکتا ہے۔ (ادارہ)

اعلان

دفتر ترجمان القرآن میں پچھلے سالوں کے چند پرچے برائے فروخت موجود ہیں۔ ضرورتمند حضرات کی سہولت کے لیے ان کی قیمت میں پچاس فیصدی رعایت کر دی گئی ہے۔ فائل رکھنے کے خواہشمند حضرات فوری توجہ فرمائیں۔

۱۔ جون سنہ ۴۸ء	جلد ۳۱	عدد ۲	۶۔ اگست سنہ ۴۹ء	جلد ۳۲	عدد ۳
۲۔ جولائی سنہ ۴۸ء	〃 〃	〃 ۳	۷۔ ستمبر سنہ ۴۹ء	〃	〃 ۴
۳۔ اگست سنہ ۴۸ء	〃 〃	〃 ۴	۸۔ نومبر سنہ ۴۹ء	〃	〃 ۶
۴۔ ستمبر سنہ ۴۸ء	〃 〃	〃 ۵	۹۔ دسمبر۔ جنوری سنہ ۵۰-۴۹ء	جلد ۳۳	عدد ۱، ۲، ۳
۵۔ جون و جولائی سنہ ۴۹ء	جلد ۳۲	〃 ۱، ۲	۱۰۔ مارچ سنہ ۵۰ء	〃 〃	〃 ۴

۱۱ -	اپریل ۵۰ء	جلد ۳۳	عدد ۵
۱۲ -	مئی 〃	〃 〃	〃 ۶
۱۳ -	جون 〃	〃 ۳۴	〃 ۱
۱۴ -	جولائی تا ستمبر ۵۰ء	〃 〃	〃 ۲،۳،۴،۵
۱۵ -	اکتوبر ۵۰ء	〃 〃	〃 ۶
۱۶ -	نومبر 〃	〃 ۳۵	〃 ۱
۱۷ -	دسمبر 〃	〃 〃	〃 ۲
۱۸ -	جنوری-فروری ۵۱ء	〃 〃	〃 ۳،۴
۱۹ -	مارچ-اپریل	〃 〃	〃 ۵،۶،۱
۲۰ -	ستمبر 〃	〃 ۳۶	〃 ۵-۶
۲۱ -	اکتوبر 〃	〃 ۳۷	〃 ۱
۲۲ -	نومبر 〃	〃 〃	〃 ۲
۲۳ -	اپریل و مئی ۵۲ء	〃 ۳۸	〃 ۱-۲
۲۴ -	دسمبر 〃	〃 ۳۹	〃 ۳
۲۵ -	جولائی-اگست ۵۳ء	〃 ۴۰	〃 ۴-۵
۲۶ -	ستمبر 〃	〃 〃	〃 ۶
۲۷ -	اکتوبر 〃	〃 ۴۱	〃 ۱
۲۸ -	نومبر 〃	〃 〃	〃 ۲
۲۹ -	دسمبر 〃	〃 〃	〃 ۳
۳۰ -	مارچ ۵۴ء	〃 ۴۱	〃 ۶
۳۱ -	اپریل 〃	〃 ۴۲	〃 ۱
۳۲ -	جولائی ۵۴ء	جلد ۴۲	عدد ۴
۳۳ -	اگست 〃	〃 〃	〃 ۵
۳۴ -	ستمبر 〃	〃 〃	〃 ۶
۳۵ -	نومبر 〃	〃 ۴۳	〃 ۲
۳۶ -	مارچ ۵۵ء	〃 〃	〃 ۶
۳۷ -	اپریل ۵۵ء	〃 ۴۴	〃 ۱
۳۸ -	مئی 〃	〃 〃	〃 ۲،۳
۳۹ -	جون 〃	〃 〃	〃 ۴
۴۰ -	جولائی 〃	〃 〃	〃 ۵
۴۱ -	اگست 〃	〃 〃	〃 ۶
۴۲ -	ستمبر 〃	〃 جلد ۴۵	عدد ۱
۴۳ -	اکتوبر 〃	〃 〃	〃 ۲
۴۴ -	جنوری ۵۶ء	〃 〃	〃 ۵
۴۵ -	فروری 〃	〃 〃	〃 ۶
۴۶ -	اپریل 〃	〃 ۴۶	〃 ۲
۴۷ -	جون 〃	〃 〃	〃 ۴
۴۸ -	اکتوبر 〃	〃 ۴۷	〃 ۱،۲
۴۹ -	نومبر 〃	〃 〃	〃 ۳
۵۰ -	دسمبر 〃	〃 〃	〃 ۴
۵۱ -	جنوری ۵۷ء	〃 〃	〃 ۵
۵۲ -	جون ۵۷ء	〃 ۴۸	〃 ۲،۳

۵۳ - جولائی ۱۹۵۷ء جلد ۴۸ عدد ۴
۵۴ - اگست " " " ۵
۵۵ - ستمبر " " " " " ۶
۵۶ - اکتوبر و نومبر " ۴۹ " ۱، ۲
۵۷ - دسمبر ۱۹۵۷ء " " " ۳
۵۸ - فروری ۱۹۵۸ء " " " ۵
۵۹ - مارچ " " " " ۶
۶۰ - اپریل " ۵۰ " ۱
۶۱ - جولائی " " " " ۴
۶۲ - ستمبر " " " " ۶
۶۳ - اکتوبر " " ۵۱ " ۱
۶۴ - نومبر " " " " ۲
۶۵ - دسمبر " " " " ۳
۶۶ - جنوری ۱۹۵۹ء " " " ۴
۶۷ - فروری " " " " ۵
۶۸ مارچ " " " " ۶
۶۹ اپریل ۱۹۵۹ء جلد ۵۲ عدد ۱

۷۰ - مئی ۱۹۵۹ء جلد ۵۲ عدد ۲
۷۱ - جون " " " " ۳
۷۲ - جولائی " " " " ۴
۷۳ - اگست " " " " ۵
۷۴ - ستمبر " " " " ۶
۷۵ - اکتوبر " جلد ۵۳ " ۱
۷۶ - نومبر " " " " ۲
۷۷ - دسمبر " " " " ۳
۷۸ - جنوری ۱۹۶۰ء " " " ۴

جلد ۵۱ عدد ۱ تا جلد ۵۲ عدد ۴ قیمت فی پرچہ ۸ر ہوگی۔ ایجنٹوں کے لیے ایجنسی کمیشن کے حساب سے قیمت ادا کرنی ہوگی۔ جلد ۵۱ سے سابقہ پرچوں کی قیمت نصف وصول کی جائے گی۔ ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

(مینجر ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور)

خـــالی صفحـــه

مطبوعات اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

تصنیفات سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱- اسلام اور جدید معاشی نظریات

مجلد معہ گرد پوش ۲/۴

۲- پردہ ,, ۴/-

۳- حقوق الزوجین ,, ۲/-

۴- خطبات ,, ۴/۴

۵- رسالہ دینیات ,, ۲/۸

۶- سلاجقہ ,, ۳/۸

۷- اسلامی قانون اور پاکستان میں

اسکے نفاذ کی عملی تدابیر ۱/-

۸- اسلامی دستور کی تدوین ۱/-

۹- سلامتی کا راستہ ,, -/۶/۶

۱۰- اسلام اور جاہلیت ,, -/۱۰/-

۱۱- اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر -/۱۰/-

۱۲- انسان کا معاشی مسئلہ اور اس

کا اسلامی حل -/۱۰/-

۱۳- توحید و رسالت اور زندگی بعد موت

کا عقلی ثبوت -/۱۲/۶

۱۴- اسلامی تہذیب اور اس کے

اصول و مبادی زیر طبع

۱۵- تنقیحات ,,

۱۶- ٹوورڈس انڈرسٹینڈنگ اسلام

بالکل نیا ترجمہ رسالہ دینیات

از پروفیسر خورشید احمد

ایم اے - ایل ایل بی زیر طبع

افضل حسین ایم - اے- ایل - ٹی :

۱۷- اخلاقی کہانیاں حصہ اول -/۶/۶

۱۸ - اخلاقی کہانیاں حصہ دوم -/۶/۶

۱۹- ,, سوم -/۱۰/-

۲۰- ,, چہارم -/۱۰/-

محمد عبدالحی !-

۲۱- داعی اسلام کی حیات طیبہ -/۸/۴

۲۲- نبیوں کے حالات حصہ اول -/۶/۶

۲۳- ,, دوم -/۱۰/-

۲۴- ,, سوم -/۱۰/-

۲۵- ,, چہارم -/۴/۱

چوہدری بہاول خاں ناگرہ صاحب :-

۲۶- اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام -/۶/۱

بچوں کی خاص کتابیں :-

۲۷- قاعدہ ہماری کتاب -/۱۰/-

۲۸- ہماری کتاب اول -/۱۲/-

۲۹- ,, دوم ۱/-/-

۳۰- ,, سوم ۱/۴/-

۳۱- ,, چہارم ۱/۶/-

۳۲- ,, پنجم ۱/۶/-

اپنی فرمائشیں حسب ذیل پتہ پر ارسال فرمائیے-

اسلامک پبلیکیشنز - ۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور